اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ نثرِ حالی

جلد دوم

تقریریں اور تقریظیں

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

مجلس ترقی ادب ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : نومبر ۱۹۶۸ع

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
صدارتی تمغہ ، حسن کارکردگی
ناظم ، مجلس ترقی ادب ، لاہور
طابع : محمد ذوالفقار خاں
مطبع : زرین آرٹ پریس ریلوے روڈ ، لاہور
سرورق : مطبعِ عالیہ ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور
قیمت : آٹھ روپے پچاس پیسے

بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۹۱

اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ نثرِ حالی

جلد دوم

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

ناشر
مجلسِ ترقیٔ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار عنوان صفحہ

۱۔ تقریریں

از صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۵۵

۱۔ قومی ہمدردی پر لکچر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳
۲۔ ایڈریس باشندگان دہلی (لارڈ لٹن گورنر جنرل کی خدمت میں) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹
۳۔ علی گڑھ کالج میں ایک تقریر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۴
۴۔ تقریر جلسۂ تعزیت حکیم محمود خاں صاحب مرحوم ۔ ۲۹
۵۔ تقریر بر موقع اجلاس اول ندوۃ العلماء ۔ ۔ ۔ ۳۳
۶۔ تقریر متعلق مجوزہ مسلم یونیورسٹی ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۸
۷۔ تقریر متعلق اصلاح و ترقی مسلمانانِ پانی پت ۔ ۔ ۷۴
۸۔ سرسید مرحوم پر ایک تقریر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸۰
۹۔ تقریر متعلق وکٹوریہ میموریل لائبریری پانی پت ۔ ۱۱۰
۱۰۔ تقریر صدارت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (کراچی) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱۹
۱۱۔ اختتامی تقریر اجلاس کراچی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۴۹
۱۲۔ تقریر بر موقع عطائے خطاب حکیم اجمل خاں صاحب ۔ ۱۵۲

نمبر شمار — عنوان — صفحہ

۲۔ تقریظیں

(الف) کتب

صفحہ ۱۵۹ تا صفحہ ۳۲۵

۱۔ تاریخ ہندوستان (مؤلفہ منشی ذکاء اللہ) ۱۵۹
۲۔ نظم الممالک ترجمہ اقوام المسالک فی معرفت احوال الممالک (مترجمہ مولوی محمد اسماعیل) ۱۶۶
۳۔ نیرنگ خیال (مؤلفہ مولوی محمد حسین آزاد) ۱۷۶
۴۔ آبِ حیات۔ ۱۸۷
۵۔ منطق استقرائی (از محمد حسین نامی) ۱۹۵
۶۔ رسالۂ منتہی العروض اور مثنوی تحفۃ الشعراء (از سید محمود دہلوی) ۱۹۹
۷۔ فرہنگ آصفیہ (مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی)۔ ۲۰۱
۸۔ ’گلستان‘ کا ناگری ترجمہ (از پنڈت مہر چند داس)۔ ۲۰۷
۹۔ سیرۃ النعمان (از مولانا شبلی) ۲۱۰
۱۰۔ انوار الاخلاق (از مولوی نور احمد نور) ۲۱۷
۱۱۔ باجرہ (مترجمہ مولوی محمد حسن خاں) ۲۲۰
۱۲۔ علمائے سلف (از مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی)۔ ۲۲۳
۱۳۔ انشائے نور احمد (از مولوی نور احمد) ۲۲۷
۱۴۔ تصانیف عزیز صفی پوری ۲۲۹
۱۵۔ نظمِ دل افروز (مجموعۂ کلام سید شجاع الدین انور) ۲۳۲

نمبر شمار — عنوان — صفحہ
۶ - جدید اُردو لٹریچر کے مشہور مصنفین (از شیخ عبدالقادر) ۲۳۸
۱۷۔ مضمون مسئلۂ ازدواج (از مولوی محمد اختر) ۲۴۰
۱۸۔ کلیاتِ دلمیر (از منور خاں دلمیر) ۲۴۲
۹ - معلّم الشطرنج (از راجا بابو) ۲۵۵
۲۰۔ لکچر ”حمایت اسلام“ اور نظم ”تصویر عبرت“ (از مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی) ۲۶۰
۲۱۔ قوانینِ دولت (از مولانا خواجہ غلام الحسنین پانی پتی) ۲۶۲
۲۲۔ سیاقِ دکن (از نواب عزیز جنگ) ۲۶۵
۲۳۔ فلسفۂ تعلیم (مترجمہ مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی) ۲۶۷
۲۴۔ مشیرِ نسواں (از صغریٰ ہمایوں مرزا)۔ ۲۶۹
۲۵۔ سوانح مولانا روم (از مولانا شبلی نعمانی) ۲۷۴
۲۶۔ تبصرہ بر مضمون ”علی گڑھ کالج کی شورش“ ۲۷۶
۲۷۔ فرہنگِ حامدیہ (از مولوی عبدالمجید رام پوری) ۲۷۸
۲۸۔ گلدستۂ اخلاق (از لالہ رگھو ناتھ سہائے) ۲۸۳
۲۹۔ اعجاز عشق اور کارنامۂ دانش (از مولانا شاطر مدراسی) ۲۸۵
۳۰۔ خاتونانِ ہند (از لالہ رگھو ناتھ سہائے)۔ ۲۸۷
۳۱۔ سوانح عمری حضرت محمدؐ (از شردھے پرکاش دیو) ۲۹۰
۳۲۔ دستۂ گل (مولانا شبلی کا فارسی کلام) ۲۹۲
۳۳۔ تصانیف نواب عزیز جنگ بہادر۔ ۲۹۴
۳۴۔ فلسفۂ ازدواج (از مولوی سید اصغر علی بلگرامی) ۳۰۵

نمبر شمار عنوان صفحہ

۳۵۔ معرکۂ مذہب و سائنس (مترجمہ مولوی ظفر علی خان) ۳۰۷
۳۶۔ خطوط امیر احمد مینائی (مرتبہ مولوی احسن اللہ خان ثاقب) ۳۰۸
۳۷۔ حکمتِ عملی (از پروفیسر مرزا سجاد بیگ) ۳۱۱
۳۸۔ خم خانۂ جاوید (از لالہ سری رام ایم۔ اے) ۳۱۴
۳۹۔ حیات النذیر (از سید افتخار عالم مارہروی) ۳۱۹
۴۰۔ تسخیرِ شوہر (از مولوی سید احمد دہلوی) ۳۲۵

(ب) رسائل و اخبارات

صفحہ ۳۲۹ تا صفحہ ۳۵۱

۱۔ رسالۂ ادیب (فیروز آباد) ۳۲۹
۲۔ رسالۂ افسر (حیدر آباد دکن) ۳۳۱
۳۔ رسالۂ معارف (پانی پت) ۳۳۶
۴۔ رسالۂ اتحاد (لکھنؤ) ۳۳۸
۵۔ رسالۂ دکن ریویو (بمبئی) ۳۳۹
۶۔ رسالۂ زمانہ (کان پور) ۳۴۱
۷۔ رسالۂ آفتاب (جھالرا پاٹن) ۳۴۲
۸۔ رسالۂ پنجاب ریویو (کرم آباد) ۳۴۳
۹۔ روزنامہ ہمدرد (دہلی) ۳۴۵
۱۰۔ رسالۂ العصر (لکھنؤ) ۳۴۷
۱۱۔ رسالۂ اُردو (جالندھر) ۳۴۹
۱۲۔ رسالۂ عزیز (آگرہ) ۳۵۱

۱۔ تقریریں

١

قومی ہمدردی پر لکچر

(ماہنامہ 'رسالہ' انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور جلد ٣ نمبر ۴
بابت ماہ اپریل ١٨٧٦ع صفحہ ١٦ تا ٢٧)

آنیسویں صدی کے آخری ُربع میں 'انجمن مفید عام' قصور ضلع لاہور کی طرف سے ایک بہت اعلیٰ درجے کا علمی و ادبی ماہنامہ 'رسالہ' کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے ادیب اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اُس کے ایڈیٹر اُس وقت ایک بہت لائق اور قابل شخص مولوی مرزا فتح محمد بیگ امامِ فنِ مناظرہ تھے۔ اُنھوں نے مولانا حالی کی یہ تقریر 'رسالہ' میں اپنی تمہید کے ساتھ بڑے فخر سے شائع کی اور کہیں کہیں بہت مفید حواشی بھی لکھے۔ ہم وہ تقریر مع تمہید اور حواشی کے یہاں نقل کرتے ہیں۔ (محمد اسماعیل)

یہ مضمون ہماری انجمن کے معزز اور لائق فائق آنریری ممبر جناب کمالات انتساب مولانا مولوی خواجہ الطاف حسین خاں صاحب حالی دام برکاتہ' نے دہلی سوسائٹی کے جلسے میں ٢١ اپریل ١٨٧٦ع کو ٨ بجے صبح کے بہت سے ارباب دیسی اور یورپین کے سامنے بکمال فصاحت اور بلاغت پڑھ کر سنایا۔ اُس ارادت اور

عقیدت سے قطع نظر کر کر جو ہم کو خالصتاً جناب مولف صاحب سے ہے، سچے دل سے اقرار کرتے ہیں کہ جو مضمون 'ہمدردی' کے بارے میں جناب ممدوح نے تسطیر فرمایا، بہمہ وجوہ عمدہ اور قابل‌قدر ہے۔ اُن کے مقدمات کی حسن ترتیب، اُن کے فقرات کی شستگی اور پاکیزگی، اُن کے لفظوں کی خوبی اور خوش اسلوبی اور معانی اور بیان کی صفائی، عبارت کی سلاست اور فصاحت اور مقاصد کی بلاغت اور متانت، غرض جس کی طرف نظر ڈالو یہی شعر اُن کے مناسب حال معلوم ہوتا ہے:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

چوں کہ یہ مضمون ملکی بہتری اور بہبودی کے اصولوں کو کماحقہ حاوی تھا، اس لیے بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ و ھو ھذا۔
(فتح محمد بیگ ایڈیٹر رسالہ)

یہ جلسۂ مبارک، جس میں مختلف قوموں کے ممتاز اور جلیل القدر آدمی جمع ہیں اور ظاہرا اُن کا تشریف لانا کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں معلوم ہوتا، انسان کی اُس خصلت کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس پر مجھ کو اس وقت بحث کرنی منظور ہے، اور جو آج کل 'ہمدردی' کے نام سے مشہور ہے۔ 'ہمدردی' کا لفظ 'ہم' اور 'درد' دو فارسی کلموں سے مرکب ہے۔ 'درد' کے معنی دکھ اور تکلیف کے ہیں اور 'ہم' کا لفظ اشتراک کے معنی دیتا ہے۔ پس 'ہمدردی' کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے؛ خواہ ارادے سے ہو خواہ بے ارادہ۔ مگر آج کل کے استعمال میں ہمدردی سے وہ شرکت مراد لی جاتی ہے جو ارادے سے کی جائے؛ مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور دوسرا رحم یا محبت سے اُس کی دوا دارو کرتا ہے، تو دوسرے کو پہلے کا

ہمدرد کہیں گے ۔

ہمدردی پر جس قسم کی بحث فلاسفی میں کی گئی ہے ، اُس کا ذکر کرنا شاید اس موقع پر مناسب نہ ہوگا ۔ پس میں اُس کی ماہیت بیان کرنے کی نسبت زیادہ تر اُس کے نتائج سے بحث کروں گا ۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی دریا کے مختلف شعبے ہیں ، تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ تمام انسان ایک دوسرے کی ہمدردی کے ذمہ دار ہیں ، اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہم جنسوں سے مدد لینے کا استحقاق رکھتا ہے ۔ کون ہے جو اس بات سے انکار کرے گا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلق ہے جو ایک کو دوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں اُس ہمدردی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے ۔ بے شک جب تک کہ باپ کے خون کا قطرہ اولاد کی رگ و پے میں باقی ہے ، ہمدردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتا ۔ ہمدردی اَور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے ۔ بچوں کو ایک مدت تک پرورش کرنا ، اُن کے لیے غذا بہم پہنچانی ، تابمقدور ان کو دشمن کے حملے سے بچانا سب جانوروں کی عام خصلت ہے ۔ اس کے سوا عام ہمدردی بھی اُن میں دیکھی گئی ہے ۔ جنگلی بطخوں کا غول جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چگتے ہیں ، مگر اُن میں سے ایک ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہم جنسوں کی چوکسی کرتی ہے ، اور جب تک پہرا دیتی رہتی ہے ایک دانہ نہیں کھاتی ۔ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے تو کبھی تن پروری نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اپنے ہم جنسوں کو خبر کر دیتا ہے اور تھوڑی سی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع کر دیتا ہے ۔ اسی طرح

اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں : ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں بھی ضرور رکھی گئی ہے کیوں کہ جو خوبیاں قدرت نے اَور حیوانات کو عنایت کی ہیں ، انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے ۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے جو بغیر تعلیم اور اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بہ خود جوش مارتی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اَور حیوانات میں ، جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں ، اس کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا ۔

ہمدردی انسان میں اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ کارخانۂ دنیا کا انتظام برہم نہ ہونے پائے ، کیوں کہ انسان اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں ۔ ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی ۔ سب سے زیادہ حقیر حلال خور کی قوم سمجھی گئی ہے مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے جس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا ۔ پس اگر انسانوں میں ہمدردی نہ ہو تو یہ تمام کارخانہ درہم برہم ہو جائے ۔

شاید یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ دنیا میں جو کام اپنی ذاتی اغراض کے لیے کیے جاتے ہیں ، وہ ہمدردی میں کیوں کر داخل ہو سکتے ہیں : مثلاً کسان زمین کے بونے جوتنے میں جو کوشش کرتا ہے اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لے جاتا ہے ، اُس سے اگرچہ اَوروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے مگر اُن کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے ، پس اس کو ہمدردی کیوں کر کہہ سکتے ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو خصلتیں انسان کو قدرت نے تعلیم کی ہیں ، وہ کبھی اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہوتیں ۔ پس ہمدردی جو کہ آدمی کی قدرتی خاصیت ہے ، اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہوسکتی ۔ جو شخص کسی اپنے ہم جنس کو نفع

پہنچاتا ہے وہ حقیقت میں اپنی آسائش کے کسی وسیلے کو تروتازہ کرتا ہے ، اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے ۔ قدیم زمانے میں ستھیا والے جو کہ دریاے ڈینیوب اور ٹائبر کے درمیان بستے تھے ، جب اُن کے بڑے بوڑھے اپنے بال بچوں کو باہم ہنستے بولتے ، ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک پاتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ نہایت عمدہ ترکہ جو ہم اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جائیں گے ، وہ یہی ہمدردی ہے جس کے آثار ہماری اولاد میں پائے جاتے ہیں ۔

ہمارے ہم وطن بھی ہمدردی کی اصل سے بے خبر نہیں ہیں ۔ کوئیں بنوانے ، پیاؤ بٹھانی ، سبیل لگانی ، محتاجوں کی خبر لینی ، بیواؤں کی مدد کرنی ، بیاہ شادیوں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کا کام بٹوانا ، بیمار کی عیادت ، میت کی تعزیت اور اسی طرح اور بہت سی باتیں ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ بعض اوقات یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے ، مشق اور تعلیم سے تمام قوم میں پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر کسی قدر تیز ہو جاتا ہے ۔ چناں چہ لائی کرگس اور سولن ، جو یونان کے دو بڑے مقنن گزرے ہیں ، انھوں نے اسپارٹا اور ایتھنز[1] والوں کی ترقی کے لیے جہاں

۱- ایتھنز وہ شہر ہے جس کو عربی میں مدینۃ الحکماء کہتے ہیں اور جس میں سقراط رہا کرتا تھا اور جہاں سقراط نے ایک مدت دراز تک تہذیب و شائستگی کے پھیلانے میں اور اپنے ہم وطنوں کو حسن اخلاق سکھلانے اور اُن کے دلوں کو روشن کرنے میں نہایت کوشش کی ۔ اور آخرکار اسی شہر میں ۶۹ برس کی عمر میں شہر مذکور کے باشندوں نے اُس پر یہ الزام لگا کر کہ وہ ہمارے شہر کے نوجوانوں کے اخلاق اور خیالات میں فساد ڈالتا ہے ، زہر دے کر مار ڈالا ۔ (فتح محمد)

اور بہت سی تجویزیں کی تھیں ، اُن ہی میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ لوگوں کو طرح طرح سے ہمدردی کی ترغیب دی جائے ۔ چناں چہ اسی خیال سے لائی کرگس نے اول اسپارٹا میں تمام اراضی برابر حصوں پر تقسیم کر دی ، تاکہ رعایا میں دولت و افلاس کا فرق باقی نہ رہے ، اور ایسی صورت ہو جائے کہ جیسے ایک ماں جائے بھائی اپنے مورث کے ترکے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔ پھر یہ قاعدہ جاری کیا گیا کہ لوگ گھروں میں کھانا چھوڑ دیں بلکہ سب آپس میں مل جل کر کھانا کھایا کریں اور ہر شخص یہ خیال رکھے کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں رہا ۔

سولن نے ایتھنز میں یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو تکلیف پہنچائے تو دیکھنے والا مغلوب کی مدد کرے اور غالب کو سزا دلوا دے تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہونے کی عادت پڑے اور ساری رعیت ایک خاندان کے آدمی ہوں ۔ اس کے سوا یہ بھی حکم تھا کہ جو لوگ رفاہِ ملک کے جلسوں میں شریک نہ ہوں اور اس بات کے منتظر رہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے[1] ، وہ جلا وطن کیے جائیں اور اُن کی جائداد ضبط کی جائے ۔ ان تجویزوں سے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جوش بہت ہو گیا تھا اور ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں ۔

ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دے رہی ہے ۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سررشتۂ تعلیم[2] ہے کیوں کہ

۱- ایسے مردہ دل اب بھی موجود ہیں جو رفاہِ عام کے کاموں کی نسبت ایسا ہی انتظار کر رہے ہیں ۔ (فتح محمد)

۲- لیکن اس کی درستی کی بہت ضرورت ہے ۔ (فتح محمد)

اس کے سبب سے بے‌شمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل‌جول رکھنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا بیج بویا جاتا ہے ۔ پس ضرور ہے کہ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر ملک میں متفرق ہوں ، تو ان کا تعلق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے ۔ اس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم یا فنون کی تعلیم کے لیے رعایا کی طرف سے فراہم ہو ، اُسی کے برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے ، ہم کو زبردستی اس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرانٹ ان ایڈ کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں ۔

میونسپل کمیٹیاں ، جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں ، اگر پورا پورا اپنا فرض ادا کریں اور جس غرض کے لیے مقرر ہوئی ہیں ، اُسی کو مدنظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے نمونے ہیں ۔

علمی جلسے[1] یا قومی سوسائٹیاں[2] ، جن کی بنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے پرتو سے ہندوستان میں پڑی ہے ، اگر اُن میں کچھ

---

[1] علمی یا قومی جلسے جہاں جہاں قائم ہیں ان کے قیام سے بہتریِ ملک اور بہبودیِ قوم یقیناً متصور ہے ، بشرطیکہ جو فرض ان کے ممبر ہونے سے ہے وہ قبل ممبر ہونے کے سوچ لیا کریں اور ہر ایک مجلس ایسے لوگوں کی تعداد بہم پہنچائے جو ذاتی لیاقت کے علاوہ اصول مجالس سے بخوبی واقف ہوں (فتح محمد)

[2] میونسپل کمیٹیاں اپنا فرض کما حقہ ادا نہیں کر سکتیں تاوقتیکہ ممبروں کے انتخاب میں واجبی توجہ نہ کی جاوے اور تعلیم یافتہ ممبر نہ انتخاب کیے جائیں (فتح محمد)

جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹیاں نہ ہوں تو وہ سر جیون چشمے ہیں جن سے تمام ملک سیراب ہو سکتا ہے ۔

زمانہ بھی طرح طرح سے ہم کو ہمدردی کی طرف مائل کر رہا ہے ۔ ایک اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم ، جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکم راں ہے ، اُس کا چال چلن ، اُس کے اخلاق ، اُس کا طریق معاشرت ، اُس کے علوم و فنون ، اُس کی دانش مندی ، اس کی تہذیب ، اُس کی نئی نئی ایجادات ، جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں ، جب ان باتوں کو اپنے ملک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موج زن ہو ۔

مذہب بھی ہم کو بہت زور سے ہمدردی کی طرف کھینچتا ہے ۔ ہندو ، مسلمان اگر اپنی مذہبی کتابیں دیکھیں گے تو اُن کو ہمدردی کی ترغیب سے مالا مال پائیں گے ۔

یہ تمام تقریر جو اب تک کی گئی ہے ، اس سے تین باتیں ثابت ہوئیں : ایک یہ کہ قادر مطلق نے اپنے ہم‌جنسوں کی ہمدردی انسان کی سرشت میں پیدا کی ہے ۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی کا عمل درآمد قدیم سے کسی نہ کسی قدر ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ بہت سے اسباب ہمارے دائیں بائیں ایسے موجود ہیں جو ہر وقت ہم کو ہمدردی کی ترغیب دلاتے ہیں ۔ پس ہمارے ہم وطنوں میں اعلیٰ درجے کی ہمدردی پائی جانی چاہیے ۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھیے تو وہ بے‌سمجھ چیونٹا جو اپنی فتوحات سے ساری قوم کی پرورش کرتا ہے اور وہ نادان بطخ ، جو اپنے ساتھیوں کی نگہبانی میں گھڑیوں ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی ہے ، ہم سے بہت زیادہ اس فخر کی مستحق ہے ۔ ہمارے ملک میں تین قسم کے آدمی

ہیں : ایک دولت مند ، دوسرے تعلیم یافتہ ، تیسرے وہ جو نہ دولت مند ہیں ، نہ تعلیم یافتہ ۔ پچھلے گروہ سے ملک کو کوئی عام فائدہ نہیں پہنچ سکتا مگر پہلے دونوں گروہوں کو ملک کی ترقی اور بہبودی میں اُسی قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو ۔ بہت سے فائدے ایسے ہیں جو ملک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں پہنچ سکتے ۔ مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں معزز گروہ آج تک ملک کے حقوق سے کچھ بھی سبکدوش نہیں ہوئے[1] ۔ دولت مندوں میں اکثر بے پروائی سے اور بعضے اس خیال سے کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیوں کر بدل سکتی ہے ، ہم وطنوں کی بھلائی کا خیال نہیں کرتے ۔ جو لوگ بے پروائی سے ادھر متوجہ نہیں ہوتے اُن سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر اُن کو اپنے ہم وطن بھائیوں کی پروا نہیں ہے تو کیا اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ اُن کی دولت کی ترقی ہو ، اُن کی عزت گورنمنٹ میں زیادہ ہو ، اُن کی اولاد علم اور لیاقت حاصل کرے ، اُن کے خاندان کی عزت و آبرو

---

[1] حقیقتاً انسان حسبِ تقسیم جناب مؤلف تین قسم ہیں ؛ تیسری قسم سے کوئی ملکی یا قومی فائدہ عموماً نہیں پہنچ سکتا ۔ رہے دو گروہ ، اُن کی بابت میری رائے میں ایک نہایت نازک بحث کی ضرورت ہے ۔ دولت مندوں کو یہ خیال کہ ہماری ترقیِ دولت و عزت قومی عزت کے حصول پر موقوف ہے ، بجز کامل تعلیم کے نہیں ہو سکتا اور عام تعلیم قومی ہمدردی اور قومی ہمت و اتفاق پر موقوف ہے ۔ پس قومی تعلیم قومی اتفاق پر اور قومی اتفاق قومی تعلیم پر موقوف ہے ۔ نتیجہ یہ کہ جب تک دولت مند تعلیم یافتہ نہ ہوں ، تب تک اُن سے قومی اعانت کی اُمید نہیں ہو سکتی ۔ اور تعلیم یافتہ لوگ جو آج کل بی ۔ اے اور ایم ۔ اے پاس کرتے ہیں ، اُن کو تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ قومی ترقی اس ملک میں نہیں ہوتی ۔ (فتح محمد)

ہمیشہ بنی رہے ۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ جب تک تمام قوم کسی نہ کسی قدر عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی ، اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے ۔ جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی ، علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا ۔ جب تک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے ، کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کر سکتا ۔ جب تک تمام قوم مرفہ‌الحال نہیں ہوتی ، کوئی شخص دولت و حشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ۔

قوم ایک درخت کی مثال رکھتی ہے[1] ، جس کی ٹہنیاں اُس کے مختلف خاندان ہیں اور اُس کے پتّے ہر ایک خاندان کے مرد و

---

[1] بے شک قوم ایک درخت کی مثال ہے اور بقول مؤلف ممدوح نہایت دلچسپ اور مناسب مثال ہے مگر ہماری قوم اُس درخت سے مماثل ہے جس کی چھال سے رسی بن سکتی ہے اور وہ درخت کسی ایسے موقع پر قائم ہے کہ پانی کا چشمہ اُس کے نیچے نزدیک تو ہے مگر بلا وساطت رسی کے نکل نہیں سکتا ۔ پس اگر درخت کی مختلف شاخوں سے اُس کی مقدار بھر چھال اُتاری جاوے جس سے اُن کی اصلی حیثیت میں کوئی نقص عائد نہ ہو اور اُس رسی کے ذریعے سے درخت مذکور کی جڑ کو بخوبی پانی پہنچ سکے تو وہ سارے درخت کی شاخوں اور پتّوں کی شادابی کا سبب ہوگا ۔ اسی طرح اگر ہماری قوم کے مختلف خاندانوں میں سے مقدور بھر روپیہ لے کر کوئی علمی کالج یا قومی کارخانہ قائم کیا جائے تو وہ قوم کے ہر ایک خاندان کی عزت اور ثروت کا سبب ہوگا اور اُس کے برخلاف عمل کرنے میں جب درخت جڑ سے سوکھ جاوے گا تو ہر ایک شاخ اور پتّا جو خاندان اور مرد و عورت سے مراد ہے ، مفلسی اور جہالت کی بادِ خزاں سے سوکھ کر گر جائے گا ۔ (فتح محمد)

عورت ۔ جب تک درخت کی جڑ ہری ہے ، اُس کی ٹہنیاں اور پتّے بھی ہرے ہیں ، لیکن جب جڑ کو پانی نہ پہنچے گا ٹہنیاں اور پتّے سب سوکھ جائیں گے ۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیوں کر بدل سکتی ہے ، ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ صرف دو خیال ہیں جنھوں نے دنیا کے تنزّل اور ترقی پر بہت کچھ اثر کیا ؛ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے ۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ کر سکتے ہیں ۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال نے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر کیے ۔ کیمبرج یونیورسٹی جس کی آج تمام دنیا میں دھوم ہے ، اُس کی بنیاد صرف اس طرح پڑی تھی کہ قصبۂ کیمبرج میں ، جو کہ لندن سے قریب ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے ، ایک باہمت پادری نے اپنے ہم‌وطنوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا تھا اور کسی قدر اپنی جائداد اُس کے خرچ میں لگا دی تھی ۔ رفتہ رفتہ اُس میں ترقی ہوتی رہی ، یہاں تک کہ اُس کی بدولت تمام برطانیہ میں علم کی روشنی پھیل گئی ۔ اب وہاں بہت بڑے بڑے سولہ کالج ہیں جن میں تقریباً تین ہزار آدمی ہزار ہزار روپیہ ماہوار تک کے نوکر ہیں ۔ اگر وہ جواں مرد پادری جس نے اس بڑے دارالعلم کی بنیاد ڈالی تھی ، یہ خیال کرتا کہ میری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے ، تو کیمبرج جو آج تمام دنیا میں مشہور ہے ، اس کا کوئی نام بھی نہ جانتا اور لاکھوں آدمی جو اُس کی بدولت امیر کبیر ہوئے یا حکیم اور فلاسفر کہلائے ، اُن کا کوئی ذکر بھی نہ کرتا ۔ اسی طرح بے شمار مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ ایک ایک آدمی کی کوشش سے ملک کے ملک سرسبز و شاداب ہو گئے ہیں ۔

تعلیم یافتہ لوگ[1] جو در حقیقت قومی ترقی کے ضروری آلات ہیں اور جن کی توجہ سے ہمارے عقدے بہت آسانی سے حل ہو سکتے ہیں ، اُنھوں نے بھی آج تک ملک کو کچھ ممنون احسان نہیں کیا ۔ سستی اور بے پروائی جو اس ملک کا خاصہ ہے ، اُن میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسے اُن کے عام ہم وطنوں میں ۔ وہ اپنے نامہذب ہم وطنوں میں عیب نکالتے ہیں مگر اُن کے عیب دور کرنے میں کوشش نہیں کرتے ۔ وہ اُن کو ہاف سویلائزڈ کہہ کر جتنا تعجب کرتے ہیں اتنا افسوس نہیں کرتے ۔ اس قابلِ ادب جماعت میں بھی کئی قسم کے آدمی ہیں ؛ ایک وہ جو تعلیم کو فقط نوکری کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جب ان کو لیاقت کی سند حاصل ہو جاتی ہے ، پھر علم اور کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے ۔ ان لوگوں سے ہم وہ اُمید نہیں رکھ سکتے جو کہ ایک تعلیم یافتہ گروہ سے رکھنی چاہیے ، کیوں کہ ان پر تعلیم کا کچھ اثر نہیں ہوا ۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے واقعی علم کو علم ہی سمجھ کر سیکھا ہے ، مگر وہ اپنے ذوق و شوق میں ایسے غرق ہوئے کہ

---

[1] میرے علم و یقین کے مطابق موجودہ تعلیم یافتہ لوگوں میں اس لیے سستی اور بے پروائی کی عادت عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ وہ حقیقتاً تعلیم یافتہ ہونے کا استحقاق نہیں رکھتے ۔ تعلیم یافتہ اُس کو کہا جا سکتا ہے جو کسی نہ کسی سائنس میں کامل دست گاہ رکھتا ہو ۔ یا کسی حد تک تعلیم پانے کا قدرتی طور پر مادہ دیا گیا ہو ۔ حال میں جس قدر تعلیم یافتہ لوگ دیکھے جاتے ہیں اُن پر علوم کا مجموعی عطر چھڑکا ہوتا ہے جو ہر وقت اُن کے ضعف کا باعث ہے ۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ہنوز بہت کم ہے ورنہ ممکن نہیں کہ انسان کامل باشعور کو ایک نفع رساں شے کا علم ہو اور وہ اُس پر عمل نہ کرے ۔ (فتح محمد)

انھوں نے صحت اور طاقت کا کچھ لحاظ نہ کیا اور اپنی حد سے بہت آگے بڑھ گئے ۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ دل و دماغ نے ان کو جواب دے دیا اور ان کو بہ مجبوری مطالعۂ کتاب سے ہاتھ اُٹھانا پڑا ۔ اُن سے بھی ہمارا کچھ کام نہیں چل سکتا کیوں کہ وہ خود اپنے کام میں درماندہ ہیں ۔ تیسرے وہ جنھوں نے علم کو بھی سمجھا اور اپنے قویٰ کو بھی محفوظ رکھا اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی کتاب کو ہاتھ سے نہیں ڈالا ؛ یہ لوگ البتہ بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بھی کچھ نہیں کرتے ۔ جن باتوں کی آج ہندوستان میں ضرورت ہے اُن کے سامان انگریزی زبان میں ہماری ضرورت سے بہت زیادہ موجود ہیں اور سردست ہم کو اس بات کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں بھی بیکن اور نیوٹن جیسے عالی دماغ پیدا ہوں ، بلکہ اب صرف اُن کی تحقیقات کو اپنی زبان میں لانا ہے ۔ گویا خرمن بالکل تیار ہے اور اس کی تیاری میں جو مشکلیں پیش آنی تھیں وہ آ چکیں ۔ خرمن کے مالکوں نے اُس کو سب لوگوں پر وقف کر دیا ۔ اب جن کے پاس باربرداری کا سامان موجود ہے وہ اس کو بھریں اور قحط زدہ ملک میں پہنچائیں ۔ پس اگر ہمارے لائق و فائق ہم وطن کچھ بھی توجہ کریں تو اپنے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں ۔

ہندوستانیوں سے عموماً دو قومیں مراد لی جاتی ہیں ؛ ایک ہندو ، دوسرے مسلمان ۔ یہ دونوں اپنے اپنے وقت میں شائستگی کے اعلیٰ درجے کو پہنچ چکے ہیں ۔ ہندوؤں کی شائستگی اُس وقت میں مانی گئی ہے جب کہ تمام دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ ہومر شاعر نے اُس زمانے کے یونانیوں کا حال مفصل لکھا ہے جب کہ منو کا مجموعہ تالیف ہوا ۔ اس زمانے میں جو حال ہندوستان اور یونان کا تھا ، اس کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اگرچہ ہمت اور دلاوری میں یونانیوں کے برابر نہ تھے مگر عام تہذیب اور شائستگی اور قوانین کی عمدگی اور انتظام کی خوش اسلوبی اور علم و ہنر کی ترقی میں یونانیوں سے بہت بڑھ کر تھے ۔ مسلمانوں کی ترقی کے زمانے کو کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا ۔ یورپ کے اکثر مؤرخوں نے جو مسلمانوں کی ترقیات کا حال لکھا ہے وہ ہماری موجودہ حالت سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس زمانے میں اس پر مشکل سے یقین آتا ہے ، اور ہم کو شرم آتی ہے کہ اس پستی اور تنزل کی حالت میں اپنے بڑوں کی ترقیات فخریہ بیان کریں ۔ لیکن اس قدر کہنا شاید بے جا نہوگا کہ زمانۂ متوسط میں صرف مسلمانوں ہی کی قوم ایسی تھی جو شائستگی اور روشن ضمیری اور اولوالعزمی میں دنیا کی تمام قوموں سے افضل تھی ۔ فرانس کا ایک نامی مؤرخ لکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرب کی قوموں کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کو اُن مختلف قوموں تک پہنچائیں جو فرات کے کنارے سے لے کر ہسپانیہ کی وادیِ کبیر تک پھیل رہی ہیں ۔ ہندو اور مسلمانوں کا یہ حال جو میں نے عرض کیا ، اس سے کچھ اپنی بڑائی ظاہر کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ اپنے ہم وطنوں کو غیرت دلانی اور یہ جتانا منظور ہے کہ جن لوگوں کی وہ اولاد کہلاتے ہیں وہ اپنے زمانے میں سب سے آگے تھے اور یہ سب سے پیچھے ہیں ، حالاں کہ جو امن و آزادی انگلش گورنمنٹ کی بدولت ان کو میسر ہے وہ ان کے بزرگوں کو کبھی میسر نہیں ہوئی ۔ پس اگر اب بھی ان سے کچھ نہ ہوا تو پھر کبھی کچھ نہ ہو سکے گا ۔ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ملک میں کہیں کہیں وطن دوست آدمی کھڑے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے عام ہمدردی کا حق پورا پورا ادا کیا ہے ۔ اُن کی کوششوں سے چندے جمع ہوئے ہیں اور قومی ترقی کے لیے مجلسیں قائم ہوئی ہیں ۔ اُن کی سعی بھی کسی قدر بارور

ہوئی ہے اور کچھ لوگ اُن کی بدولت خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔ مگر جب ہم اپنی اندرونی اور بیرونی خرابیوں کا اندازہ کرتے ہیں تو یہ تمام کوششیں ان کے سامنے ایسی بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جیسے اندھیری رات کی تاریکی کے آگے جگنو کی چمک۔ ہمارے اخلاق، ہمارا طریقِ معاشرت، ہمارے علوم و فنون، ہماری تجارت، ہماری دست کاری غرض ہمارے سب کام ایسی پستی کی حالت میں ہیں کہ ان کے اُبھارنے کے لیے نہایت زبردست طاقتیں درکار ہیں۔

جو باتیں ہماری ترقی کی مانع ہیں اُن پر میں نے کبھی کبھی غور کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ کسی روز سب صاحبوں کے سامنے اُن کو مفصل بیان کروں۔ مگر ایک امر جس کو میں مانعِ قوی سمجھتا ہوں، یہاں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں؛ اب تک جو تدبیریں ہماری ترقی کے لیے کی گئیں اور کی جاتی ہیں، اگرچہ اُن کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے اور وہ بےشک اس قابل ہیں کہ جب موقع ملے کوشش کی جائے، لیکن انگریزی رائیں غلط نہیں تو اکثر اُن میں سے ایسی ہیں جو بالفعل عام رایوں اور عام خواہشوں کے برخلاف معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی سبب سے جن لوگوں کی بہبودی کے لیے وہ کی جاتی ہیں، اکثر وہی اُن میں رخنہ انداز ہوتے اور تقریباً تمام قوم اُن میں مدد دینے سے انکار کرتی ہے۔ پس میرے نزدیک جو تدبیریں عام بہبودی کے لیے کی جائیں، وہ تا بہ مقدور ضرور ایسی ہونی چاہئیں جن کے نتائج اور فوائد عام لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آ جائیں۔ مثلاً بالفعل بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ فزیکل سائنس کی تعلیم کے لیے قائم کیا جائے، بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور دست کاری کے لیے کھولا جائے[1] کیوں کہ پہلی صورت کی نسبت دوسری صورت عام خواہشوں کی زیادہ پورا کرنے والی ہے۔ یا مثلاً پہلے اس سے کہ بیاہ شادیوں کی فضول خرچیاں بند کی جائیں، بہتر ہے کہ موت اور غمی کے اخراجات موقوف کیے جائیں۔ کیوں کہ پچھلی تجویز عام رایوں کے موافق زیادہ کارگر معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

---

[1] جناب مصنف کی یہ رائے بےشک صائب ہے کہ پہلے عام پسند کاموں کو جاری کرنا چاہیے؛ مثلاً "بالفعل بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ فزیکل سائنس کی تعلیم کا قائم کیا جائے، بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور دست کاری کے لیے کھولا جائے۔" اس رائے پر غور کرنے سے مضمون کی عمدگی کے علاوہ اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جناب مؤلف کو سلسلۂ نظام عالم کی مصلحتوں پر کافی دسترس ہے۔ چوں کہ یہ تجویز نہایت عمدہ اور مناسب اقتضائے وقت ہے اس لیے ہماری انجمن کے مدبر افسروں نے سب سے پہلے صنعت اور دست کاری کو جاری کیا جس کی ترقی ممبروں اور معاونوں کی ہمت پر موقوف ہے۔ فقط (فتح محمد)

۲

ایڈریس باشندگان دہلی

لارڈ لٹن گورنر جنرل کی خدمت میں

لارڈ لٹن ۱۸۷۶ع سے ۱۸۸۰ع تک ہندوستان کا وائسرائے رہا ہے۔ افغانستان سے دوسری جنگ اس کے عہد کا مشہور واقعہ ہے جو ۱۸۷۹ع میں ہوئی۔ انگریز اپنا ایک ریزیڈنٹ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے افغانستان میں رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جب اپنا انگریز ریزیڈنٹ افغانستان بھیجا تو افغانوں نے اسے سرحد پر ہی قتل کر ڈالا۔ اس پر مشتعل ہوکر لارڈ لٹن نے افغانستان کو فتح کرنے کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ زبردست جنگیں افغانوں اور انگریزی فوج میں ہوتی رہیں۔ بالآخر انگریز کامیاب ہوگئے اور انھوں نے اپنی مرضی کا حاکم افغانستان میں مقرر کر دیا جس کا نام امیر عبدالرحمن تھا۔ انگریزوں سے وہ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ تنخواہ پاتا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۹ع کا ہے۔

اس عارضی فتح کی خوشی میں حکومت پسند اور خوشامدی معززین دہلی نے اس موقع پر بطور اظہار مسرت وائسرائے کو ایک ایڈریس پیش کرنے کا ارادہ

کیا جسے لارڈ لٹن نے منظور کر لیا۔ اب اس ایڈریس کا مضمون انگریزی میں تیار کرنے کا سوال تھا۔ یہ قرعۂ فال دہلی کے ایک بڑے رئیس لالہ مدن گوپال ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا کے نام نکلا۔ (یہ صاحب لالہ سری رام ایم۔ اے مولف ’خمخانۂ جاوید‘ کے والد تھے) مولانا حالی کی ان سے بڑی دوستی تھی اور اس زمانے میں مولانا دہلی میں رہا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس جھنجھٹ سے بچنے کے لیے مولانا حالی سے کہا کہ ’’مولانا! آپ ایڈریس اردو میں لکھ دیں۔ میں اسے انگریزی میں ترجمہ کر دوں گا اور پھر اسے چھپوا کر وائسرائے کی خدمت میں پڑھ دیا جائے گا۔ اس پر مولانا نے از راہ انکسار فرمایا کہ ’’بھلا میں آپ کے سامنے کیا ایڈریس لکھوں گا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں لکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ نیا کام مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی بہت طول امل بات ہے کہ پہلے میں ایڈریس اردو میں لکھوں، اس کے بعد آپ اسے انگریزی میں منتقل کریں۔ کیوں نہ آپ اسے انگریزی ہی میں لکھ ڈالیں۔ اس طرح آسانی بھی رہے گی اور کام بھی جلدی ہو جائے گا۔،،

لالہ مدن گوپال بیرسٹرایٹ لا کہنے لگے کہ ’’مولانا! در اصل بات یہ ہے کہ اس وکالت کے پیشے نے دماغ کی حالت کچھ ایسی بنا دی ہے کہ جس کام میں نقد مالی فائدہ نظر نہ آئے، اس پر محنت کرنے کو مطلق طبیعت نہیں چاہتی اور دل اس پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ پس یہی مناسب ہے کہ آپ یہ

ایڈریس اردو میں لکھ دیں اور بندۂ خاکسار جھٹ پٹ آنکھیں بند کرکے اُس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالے گا۔'' اس پر مولانا ہنسنے لگے اور انھوں نے ایڈریس اردو میں لکھ دیا۔ یہ وہی ایڈریس ہے جس کا انگریزی ترجمہ وائسرائے کی خدمت میں بہ مقام دہلی پیش کیا گیا۔ مجھے اس ایڈریس کا قلمی مسودہ خود مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا اُن کے کاغذات میں سے ملا ہے جو میں ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ (محمد اسماعیل)

اس بات کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا ہے کہ ہم باشندگان دہلی وفادار رعایائے حضور ملکہ معظمہ سلطنت برطانیہ عظمیٰ و قیصرۂ ہند دام اقبالہا آپ کو بہ حیثیت نائب السلطنت ہونے کے ایک ایسے شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اورنگ قیصری پر جلوہ افروز دیکھ چکے ہیں جس کی نظیر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ ابھی وہ خوشی اور مسرت اور افتخار جو کہ ہم رعایائے دہلی کو دربار قیصری کے منعقد ہونے سے حاصل ہوا تھا، ہمارے دل سے فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ ہم نے حضور والا کو ایک ایسی فتحِ نمایاں کے بعد جس سے سراسر ہندوستان کی بہبودیِ حال و مآل متصور ہے، دیکھا۔ پس ایسے مبارک موقع پر، جو بے انتہا شکر گزاری اور احسان مندی اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا جوش ہمارے دل میں خود بخود پیدا ہوا ہے، اُس کا ظاہر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ افغانستان کی مہم نہ خزانۂ سرکاری کی توفیر اور نہ محاصل ملکی کی افزائش کے واسطے اختیار کی گئی تھی، بلکہ صرف اس لیے اختیار کی گئی تھی کہ ہندوستان کے امن و امان میں جو رخنے نظر آتے ہیں وہ مسدود کیے جائیں اور شمالی

خدشوں کی روک ٹوک کے لیے ہندوستان کی سرحد کو استحکام دیا جائے۔ ہم کو اس میں کچھ شک اور شبہ نہیں ہے کہ فوج سرکاری کو اس مہم کے اختتام تک جس قدر دقتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جلیل القدر افسروں کی بیش قیمت جانیں، جو ایک وحشی قوم کی ناعاقبت اندیشی سے تلف ہوئی ہیں، یہ سب کچھ ملک اور رعیت کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے تھا۔ پس ہمارا ضروری اور نہایت ضروری فرض ہے کہ ہم دل سے، زبان سے اور بدن کے روئیں روئیں سے گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کریں۔ اور جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ہند کو اپنی صائب پالیسی کے برقرار رکھنے میں کیسی کیسی سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے تو یہ شکر گزاری اور احسان مندی دوچند ہو جاتی ہے۔

ہم کو معتبر وسیلوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت افغانستان سے انگریزی سفارت کی مزاحمت وقوع میں آئی اُس وقت خاص کابل میں ایسے سامان جمع تھے کہ اگر چند روز اس مہم میں اور توقف کیا جاتا تو شرو فساد کی بنیاد کسی قدر زیادہ پائدار ہو جاتی اور افواج قاہرہ کو اُس کے رفع دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی۔ لیکن گورنمنٹ ہند نے ایشیا کے اس مشہور قول ''کار امروز بفردا مگذار'' پر پورا پورا عمل کرکے ملک اور رعیت کو تاخیر و التوا کے مضر نتائج سے بالکل محفوظ کردیا۔

افغانستان کی مہم، جو کہ حضور کی دلیرانہ تدبیر سے عمل میں آئی ہے، جس قدر گورنمنٹ انگلشیہ کی اولوالعزمی اور سطوت و جلالت پر گواہی دیتی ہیں، اس سے زیادہ اُس کی بردباری، تحمل، چشم پوشی اور فراخ حوصلگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انگلستان کی بہادر قوم نہ صرف اپنی اولوالعزمی اور شجاعت سے بلکہ زیادہ تر اپنے بے نظیر تحمل و استقلال اور بے مثل عدل

و انصاف اور عجیب بردباری اور حلم سے دنیا کے پانچوں بر اعظموں پر حکمران ہوئی ہے ۔ وہ کسی پر ایک تنکا نہیں اٹھاتی جب تک کوئی اس پر شہتیر نہ اٹھائے ۔ وہ کسی پر ایک وار نہیں کرتی جب تک اس پر بہت سے وار نہ کیے جائیں ۔ ہم وفادار رعایائے حضور قیصرۂ ہند آپ کو اس مبارک فتح کی بابت ، جو کہ آپ کی رائے صائب اور آپ کے معزز مشیروں کی اور آپ کے جلیل‌القدر سپہ سالاروں کی سرگرمی اور آپ کی افواج قاہرہ کی بہادری سے وقوع میں آئی ، جس کے نتائج بادشاہ اور رعیت دونوں کے حق میں بے انتہا برکتوں سے معمور ہیں ، مبارک باد دیتے ہیں ۔ اور نہایت خلوص سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس شہر کی تجارت اور صنعت روز بروز ترقی پکڑتی جاتی ہے ۔ اور اگرچہ یہاں کی تعلیم کے وسائل کسی قدر کم ہو گئے ہیں لیکن یہاں کے عام باشندے خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے پر روز بروز آمادہ ہوتے جاتے ہیں ۔ البتہ چند سال سے نامعلوم قدرتی اسباب ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے ہر سال موسم برسات اور موسم سرما میں یہاں بیماریوں اور اموات کا شمار حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے ۔ لیکن بالفعل میونسپل کمیٹی اس باب میں غور کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حفظان صحت کے کافی وسائل مہیا کیے جائیں ۔ امید ہے کہ جو کام میونسپل کمیٹی کی طاقت سے باہر ہوگا وہ گورنمنٹ کی امداد اور اعانت سے سرانجام ہو جائے گا ۔

۳

علی گڑھ کالج میں ایک تقریر

(قلمی مسودے سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے طلبائے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے سامنے اس موضوع پر فرمائی تھی کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد طلبہ کو کیا کرنا چاہیے اور اپنی معاش کس طرح حاصل کرنی چاہیے ۔ (محمد اسماعیل)

صاحبو ! میں نے آپ کو اس ہال میں جمع ہونے کی آج اس لیے تکلیف دی ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد فکرِ معاش کا دشوار گذار مرحلہ ، جو آپ کو درپیش ہے ، اس کے متعلق آپ کو چند مشورے ایسے دوں جن کو میں اپنے نزدیک آپ کے حق میں بہتر سمجھتا ہوں ۔

اے میرے عزیزو ! اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری قوم میں تعلیم کا خیال روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے اور مذہبی خیالات ، جو تعلیم کے مانع سمجھے جاتے تھے ، ان کی مزاحمت کم ہوتی جاتی ہے مگر میری رائے ، جس کو شاید تم بھی تسلیم کرو گے ، اب تک اس باب میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تعلیم کو بطوع و رغبت قبول نہیں کیا ۔ بلکہ جس طرح اضطرار کی حالت میں مکروہ اور حرام چیزیں بھی حلال سمجھ لی جاتی ہیں ، اسی طرح مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو بہ مجبوری گوارا کر لیا ہے ۔

کیوں کہ رئیس اور دولت مند مسلمان ، جو فکر معاش سے فارغ البال ہیں ، جب تک اُن کو اپنی اولاد کی تعلیم کا خیال اور شوق پیدا نہ ہو ، تب تک یہ ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا کہ مسلمان بطوع و رغبت تعلیم کی طرف مائل ہو گئے ہیں ۔ بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جن کو معاش کا کچھ سہارا نہیں ہے یا جو اپنے بعد اولاد کے لیے کوئی جائداد یا آمدنی چھوڑنے والے نہیں ہیں ، وہ انگریزی تعلیم کو محض ایک ذریعہ معاش یا نوکری کا سمجھ کر اولاد کو بہ کراہت و مجبوری تعلیم دلواتے ہیں ۔

پس اگر میرا یہ خیال صحیح ہے اور فی الواقعہ تعلیم کے خواہاں حالتِ موجودہ میں صرف وہی لوگ ہیں جو معاش کی طرف سے فارغ البال نہیں ، تو آپ میں سے ہر شخص کو تعلیم ختم کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لینا ضرور ہے کہ ہم تعلیم ختم کرنے کے بعد فلاں پیشہ اختیار کریں گے یا فلاں ذریعے سے معاش بہم پہنچائیں گے ، تاکہ ابھی سے آہستہ آہستہ اس پیشے کے لیے تیار ہونے اور اس کی لیاقت بہم پہنچانے کا موقع ملے ، اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد اندھا دھند دائیں بائیں ہاتھ مارنے کی ضرورت نہ پڑے ، بلکہ جو امر پہلے سے ٹھان لیا گیا ہو اس کو مضبوط پکڑ لیا جائے ۔

اگرچہ قوم کو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور اگر خدا کو منظور ہے تو وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے کہ تمھیں میں سے بہت سے ایسے روشن ضمیر پیدا ہوں گے جو اپنے علم کے ذریعے سے ملک اور قوم میں روشنی پھیلائیں گے اور علم کو علم ہی کے واسطے پڑھیں گے ، مگر حالت موجودہ میں تم سے یہ امید رکھنی قبل از وقت ہوگی ۔ بالفعل تمھاری تعلیم کا اشرف و اعلیٰ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تم تعلیم کے ذریعے سے معاش پیدا کرو اور جہاں تک ہو ، جائز وسائل سے روپیہ پیدا کرکے اپنے اپنے خاندان کو تقویت دو ۔ اور

جس امید پر تمھارے بزرگوں نے تمھاری تعلیم کے اخراجات اپنے حوصلے اور بساط سے بڑھ کر برداشت کیے ہیں ، ان کی اس امید کو پورا کرکے دکھاؤ ۔

مگر اے عزیزو ! تمھاری راہ میں بہت سی رکاوٹیں ایسی نظر آتی ہیں کہ جب تک وہ دور نہ کی جائیں گی ، اس وقت تک تمھارا منزلِ مقصود تک پہنچنا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ تمھارے آبا و اجداد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی اور شاہی ملازمت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا حصہ تھا ۔ تمام فوجی اور ملکی خدمات کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا تھا ۔ پس ان کے لیے وجہِ معاش کا کوئی ذریعہ نوکری سے زیادہ آسان اور سہل الحصول نہ تھا ۔ مگر تم جانتے ہو کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے ۔ اب وہ شاہی ملازمت جس میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا ، اس کے مستحق انگلستان کے چار کروڑ باشندے اور ان کے بعد ہندوستان کے پچیس کروڑ باشندے ہیں ۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ چھ کروڑ مسلمان ، جو ہندوستان میں آباد ہیں ، وہ اب بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح معاش کو نوکری میں منحصر سمجھیں ، اور نوکری کے سوا معاش کے اور ذریعوں سے اسی طرح الگ تھلگ رہیں جس طرح ان کے آبا و اجداد رہتے تھے ۔ نہ گورنمنٹ میں یہ طاقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام رعایا پر ترجیح دے کر کل خدمات و مناصب انھیں کے حوالے کر دے ۔ پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے کل مسلمان یا کم سے کم تعلیم یافتہ مسلمان ، جن کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے ، تمام پیشوں سے قطع نظر کرکے صرف سرکاری نوکری پر قناعت کر بیٹھیں ۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ جس قوم میں پُشت ہا پشت سے برابر نوکری پیشہ ہوتے چلے آئے ہیں اور جن کے

بڑوں نے کبھی تجارت ، زراعت یا صنعت و دست کاری کے ذریعے سے معاش پیدا نہیں کی ، وہ نوکری کے سوا کسی اور ذریعے سے کیوں کر معاش پیدا کر سکتے ہیں ۔ میرے نزدیک یہ خیال بالکل صحیح ہے ، کیوں کہ جس قوم یا خاندان کی چند پشتیں کسی خاص پیشے میں گزر جاتی ہیں اس کی آئندہ نسلوں میں اس خاص پیشے کے سوا کسی دوسرے پیشے کی قابلیت باقی نہیں رہتی ۔ تجارت پیشہ قوم کی اولاد ماں کے پیٹ سے تاجر پیدا ہوتی ہے اور زراعت پیشہ قوم کی نسل میں فطرةً زراعت کی قابلیت ہوتی ہے ۔ اسی طرح جو خاندان کئی پشت سے نوکری پیشہ چلا آتا ہے ، اس کی اولاد میں نوکری کے سوا کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی ۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں جس طرح تجارت و زراعت وغیرہ کی قابلیت نہیں ہے ، اسی طرح حالت موجودہ میں وہ نوکری کی قابلیت بھی نہیں رکھتے ، کیوں کہ جس طرح ان کے بزرگوں نے تجارت و زراعت وغیرہ کے ذریعے سے کبھی معاش پیدا نہیں کی ، اسی طرح کسی فارن گورنمنٹ میں ملازمت کرنے کا بھی ان کو کبھی اتفاق نہیں ہوا ۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے عہد میں آسانی سے عہدے اور منصب پاتے رہے ، اور اس لیے نہ کبھی ان کو وہ تدبیریں اور کوششیں کرنی پڑیں جن کے بغیر کسی فارن گورنمنٹ میں رسائی ہونی ناممکن ہے اور نہ اپنے تئیں وہ لیاقتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی جو ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ اور تقرب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں ۔ پس جو مشکلات کہ مسلمان نوجوانوں کو تجارت و زراعت اختیار کرنے میں نظر آتی ہیں ، وہی مشکلات حالت موجودہ میں نوکری پر عائد ہوتی ہیں ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے پیشے جو خود ہمارے اختیار میں ہیں ، ان کو چھوڑ کر ایسا کام اختیار کیا جائے جو ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ گورنمنٹ کے اختیار میں ہے اور جس کا استحقاق پیدا کرنا اور اس کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا خاص کر اس زمانے میں سخت دشوار ہے ۔

شاید میرا یہ کہنا کہ مسلمانوں میں فارن گورنمنٹ کی نوکری کرنے کی لیاقت عام طور پر ایسی ، جیسی کہ ہندوستان کی دیگر اقوام میں ہے ، نہیں پائی جاتی ، آپ کو ناگوار گزرا ہوگا ۔ فی‌الحقیقت یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ، مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر مسلمانوں کا ایسا ہی حال ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ۔ اور انصاف یہ ہے کہ ان کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے تھا ۔ مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی تمام قومیں ہزار برس سے غیر قوم کی محکوم چلی آتی تھیں ، اس لیے صبر و تحمل ، فرماں برداری ، زمانہ سازی ، فروتنی ، رفق و مدارات اور دیگر صفات ، جن پر ایک محکوم قوم کی کام یابی بلکہ سلامتی اور زندگی منحصر ہے ، طول عہد کے سبب ان کی قومی خصلتیں بن گئی تھیں ، اور جو لیاقتیں ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ و تقرب حاصل کرنے کے لیے درکار ہیں ، ان کی جبلت میں داخل ہو گئی تھیں ۔ یہی سبب تھا کہ جو قومیں ان میں روزگار پیشہ تھیں وہ جس طرح فارسی زبان آسانی سے سیکھ لیتی تھیں اسی طرح انگریزی سیکھنے میں بھی انھیں کوئی مشکل معلوم نہیں ہوئی ۔ اور جس طرح وہ مسلمانوں کے عہد میں تمام دفتروں پر حاوی تھے اسی طرح انگریزوں کے عہد میں تمام دفتر اور آفس ان سے معمور ہوگئے ۔

۴

تقریر جلسۂ تعزیت حکیم محمود خاں صاحب مرحوم

(منقول از رسالہ 'مرثیۂ حکیم محمود خاں' شائع کردہ مولانا حالی مطبوعہ ۱۸۹۲ع)

حکیم محمود خاں ، دہلی کے نہایت نامی گرامی طبیب ، عالم گیر شہرت کے مالک اور خاندان شریفی کے ایک درخشندہ گوہر تھے ۔ والد کا نام حکیم محمد صادق علی خاں تھا ۔ آپ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ع میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے ۔ ابتدائی اور انتہائی تعلیم سب کچھ گھر پر ہی ہوئی ۔ طب کی اکثر تعلیم اپنے والد سے پائی ، کچھ طبی کتابیں اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد خاں سے بھی پڑھیں ۔

'ضیاء الابصار' ، 'کارنامۂ عشرت' اور 'قانون شریفی' آپ کی تصنیفات ہیں ۔ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ع میں آپ نے وفات پائی ۔ آپ کے تین لڑکے ہوئے جن کے نام یہ ہیں : حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں (متوفی ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۹۰۱ع) ، حکیم واصل خاں (متوفی ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ع) اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں (متوفی ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ع) ۔

حکیم صاحب کے انتقال پر مولانا حالی نے ان کا نہایت ہی پُراثر اور پُر درد مرثیہ لکھا ۔ جب مولانا نے یہ مرثیہ لکھا تو حکیم صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں نے پُرزور تحریک کی کہ ایک جلسۂ عام حکیم صاحب کی تعزیت میں منعقد کیا جائے ۔ چناں چہ ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ع بروز یک شنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدرالدین خاں صاحب مرحوم کے وسیع مکان کے صحن میں منعقد کیا گیا اور وہاں مولانا نے یہ مرثیہ پڑھا ۔ مندرجہ ذیل تقریر وہ ہے جو مرثیہ پڑھنے سے پہلے 'مرثیہ لکھنے کی ضرورت' پر مولانا نے فرمائی تھی ۔ (محمد اسماعیل)

مسلمانوں میں مرثیہ لکھنے کا رواج ابتدائے اسلام سے پایا جاتا ہے اور اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی عزیزوں ، دوستوں اور مشہور لوگوں کے مرثیے برابر لکھے جاتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے جدِّ بزرگوار عبدالمطلب کے بہت سے مرثیے اب تک موجود ہیں ۔ سچ یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی ، بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیے کے ذریعے سے ہو سکتا ہے ، کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتا ۔ جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے ، اُس پر بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ عرب کے شعرا کو جب دل سے کسی کی سچی اور بے ریا تعریف کرنی ہوتی تھی تو اس کے مرنے کے بعد مرثیہ لکھتے تھے ۔ معن بن زائدہ شیبانی جو کہ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ایک نہایت فیاض اور شجاع سپہ سالار گزرا ہے ، اُس کے بے شمار مرثیے لکھے گئے ہیں ۔ ایک شاعر نے اُس کے مرثیے میں لکھ دیا تھا کہ فیاضی اُس کے ساتھ رخصت ہوگئی ، اب کس سے

فیاضی کی امید رکھیں ۔ خلیفہ مہدی نے اس جرم میں اس کو دربار سے نکلوا دیا اور امرا نے اس کو صلہ دینا موقوف کر دیا ۔ مگر اس پر بھی شعرا معن کے مرثیے برابر لکھتے رہے ۔ جعفر برمکی کو جب ہارون رشید نے قتل کروایا تو اس کے مرثیے لکھنے پر بہت سے شاعروں کو موت کی سزا دی گئی ، مگر پھر بھی لوگ اس کے مرثیے لکھنے سے باز نہ آئے ۔

فی الواقعہ کسی شخص کی شکر گزاری اور احسان مندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اس کا ذکرِ جمیل ملک میں پھیلایا جائے ۔

اسلام میں بلکہ شاید تمام دنیا میں کوئی واقعہ واقعۂ کربلا سے زیادہ عالم آشوب اور درد ناک وقوع میں نہیں آیا ، اور اسی لیے فی زمانتا مسلمانوں میں مرثیے کا اطلاق صرف جناب سیدالشہدا علیہ الصلوۃ و السلام کے مرثیوں پر ہونے لگا ہے[1] ۔ اس میں شک نہیں کہ ان مرثیوں کے سننے سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور خاندانِ نبوت کی محبت ، جو کہ اسلام کی جڑ ہے ، دلوں میں موج زن ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے صبر و استقلال کی پیروی اور اتباع کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے ، اور اسی لیے قوم کے اکثر بزرگواروں نے واقعۂ کربلا کے بیان میں اپنی عمریں تمام کر دی ہیں ، اور قوم کے رونے اور رلانے کے لیے اس قدر ذخیرے چھوڑ گئے ہیں کہ اب کسی شخص کو ان مضامین کے دہرانے کی ضرورت نہیں رہی ۔ لیکن اس زمانے میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہو گئی ہے اور تمام جماعتوں میں تفرقے پڑے ہوئے ہیں ، ان میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی از بس ضرورت ہے ۔ جہاں اس کی اور بہت سی تدبیریں ہیں ، ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جائیں ۔ اس کی خوبیاں اور اس کے محاسن ملک میں شائع کیے جائیں اور شعرا جو کہ قوم کی زبان ہیں ، تمام قوم کی طرف سے اس کے مرثیے لکھیں ، تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے ۔

اگرچہ میں اپنے تئیں اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتا کہ مجھ کو قوم کی زبان سمجھا جائے ، لیکن چوں کہ میں نے دیکھا کہ مرحومی حکیم محمود خاں کی وفات سے تمام ہندوستان میں عموماً اور دلّی میں خصوصاً ایک غیر معمولی رنج و افسوس پیدا ہوا ہے ، اور میرے اکثر احباب کو اس حادثے سے سخت صدمہ پہنچا ہے ، اس لیے میں نے چند بند بطور مرثیے کے ترتیب دیے ہیں اور ان کے پڑھنے کی آپ صاحبوں سے اجازت چاہتا ہوں[1] ۔

---

[1] یہ مرثیہ کلیات نظم حالی میں شامل ہے ۔

۵

تقریر برموقعۂ اجلاس اوّل ندوۃالعلماء

(منقول از رپورٹ اجلاس سال اول ندوۃالعلماء)

ندوۃالعلماء کے پہلے اجلاس (منعقدۂ ۱۵، ۱۶، ۱۷، شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ع) میں، جو شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا، منجملہ دیگر تجاویز کے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ چوں کہ قدیم طریقۂ درس موجودہ زمانے کے مناسب نہیں، لہٰذا اس میں ایسی معقول اصلاح اور ترمیم کرنی چاہیے کہ وہ زمانۂ حال کے موافق اور موجودہ ضروریات کو پورا کرنے والا ہو جائے۔ شرکتِ اجلاس کی مولانا حالی کو بھی دعوت دی گئی اور بانیانِ جلسہ کی خواہش پر مولانا نے کانپور جانے اور اس بارے میں اپنے خیالات علماء کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ مگر بعض خانگی معاملات کے باعث آپ کا جانا نہ ہو سکا۔ لیکن آپ نے مسئلۂ زیر بحث کے متعلق اپنی رائے مفصل طور سے قلم بند کرکے داعیانِ جلسہ کو بھیج دی تھی جو جلسے میں سنائی گئی اور اب یہاں نقل کی جاتی ہے۔ (محمد اسماعیل)

ہم کو اس بات کے سننے سے نہایت خوشی ہوئی کہ وسطِ ماہ شوال سنہ حال میں ایک مجلس علمائے اسلام کی بہ تقریبِ رسمِ دستار بندیِ طلبۂ مدرسۂ فیض عام بمقام کانپور منعقد ہونے والی ہے جس میں علاوہ رسمِ دستار بندی کے مدارسِ اسلامیہ کے انتظام اور تعلیم وغیرہ پر بھی گفتگو کی جائے گی، اور اس بات میں عام مسلمانوں کی رائے غور اور توجہ سے سنی جائے گی۔ چوں کہ راقم بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے اُن تاریخوں میں وہاں نہیں پہنچ سکتا ہے اس لیے مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس کے متعلق جو کچھ میری رائے ہے، اُس کو بذریعۂ تحریر پیش کرتا ہوں۔

مدارسِ اسلامیہ، جو ہندوستان کے اکثر قصبوں اور شہروں میں عالی ہمت مسلمانوں کی کوشش سے قائم ہوئے ہیں، جس طرح اُن کا قائم کرنا نہایت ضروری تھا، اسی طرح یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اُن کو جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید اور اُن کی موجودہ حالت کے زیادہ مطابق بنانے کی کوشش کی جائے اور سب سے مقدم اُن کے سلسلۂ کتبِ درسیہ کی اصلاح اور ترمیم ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمارا سلسلۂ درس یکساں نہیں رہا اور آج کل بھی مختلف سلسلے مدارسِ اسلامیہ میں جاری ہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانے کے علما، اپنے ملک اور زمانے کی حالت کے مطابق درس کی کتابیں مقرر کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دینیات میں صرف قرآن و حدیث کا درس ہوتا تھا، پھر فقہ اُس میں شامل ہو گئی اور رفتہ رفتہ علم اصول فقہ اُس پر اضافہ کیا گیا۔ جب تک یونانی فلسفہ مسلمانوں میں شائع نہیں ہوا تھا، اُس وقت تک مدارسِ اسلامیہ میں معقولات کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پھر جب یونانی فلسفہ درس میں داخل کیا گیا تو ایک مدت تک اس میں

علم کلام کے شامل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوئی ۔ لیکن جب یونانی فلسفے کی ممارست سے مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہونے لگے اور اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے تو علم کلام مدوّن کرنے کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی سلسلۂ درس میں شامل کیا گیا ۔ علیٰ ھذا القیاس جیسی ضرورتیں پیش آتی گئیں آنھیں کے موافق سلسلۂ درس میں تغیرّ اور تبدل اور کمی بیشی ہوتی رہی ۔

ظاہر ہے کہ پچھلے پچاس برس سے مسلمانوں کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے ۔ اس کے سوا ملک کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے ۔ مذاہب پر نہایت آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کی جاتی ہے ۔ ایسی حالت میں وہ مدارس ، جو محض دین اسلام کی تقویت کے لیے قائم کیے گئے ہیں ، آن میں بعینہ وہی سلسلۂ درس قائم رکھنا جو قدیم زمانے سے چلا آتا ہے ، اسلام کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا ۔ پس ہمارے علماء کو چاہیے کہ بہ مشورہ و صلاحِ ہم دگر مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس پر غور کرکے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے موافق اس کو از سر نو مرتب کریں ۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ بعض اسلامی مدارس کے مہتمموں کو ، جیسا کہ سنا گیا ہے ، کتبِ درسیہ کے معمولی سلسلے میں کچھ ترمیم یا تبدیلی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے ۔ مگر میری رائے میں کوئی مفید تبدیلی یا ترمیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہندوستان کے تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ اس بات پر متفق نہ ہو جائیں کہ کتبِ درسیہ میں جو تبدیلی یا کمی بیشی کی جائے گی آسی کے موافق تمام مدارس میں درس جاری کیا جائے گا ، کیوں کہ معمولی سلسلے کی کتابیں ہر جگہ بآسانی اور بہ کفایت مل جاتی ہیں ، اور اگر یہ سلسلہ بدلا گیا تو ممکن ہے کہ ایسی نئی کتابیں درس میں داخل کی جائیں جو ہندوستان میں بہم نہ پہنچیں بلکہ مصر یا بیروت وغیرہ سے منگوائی جائیں ۔ یا بڑی بڑی کتابوں میں سے کچھ کچھ مفید ابواب و مضامین انتخاب کرنے پڑیں اور آن مجموعوں کو بطور کتاب کے علیحدہ چھپوانا پڑے ۔ پس تاوقتیکہ تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ ایک سلسلۂ درس پر اتفاق نہ کر لیں تب تک نئی کتبِ درسیہ کا مہیا ہونا مشکل ہے ۔ کیوں کہ اہلِ مطابع صرف ایک دو مدرسے کے خرچ کے لیے نئی کتابیں ، جن کی ملک میں عام خریداری نہ ہو ، نہیں چھاپ سکتے اور نہ کسی مدرسے کے مہتمم چھپوا سکتے ہیں ۔

اب میں معمولی سلسلۂ درس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا ہوں ؛ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ معمولی سلسلہ کتبِ درسیہ کا سراسر مناسب اور مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے ، تو بھی میرے نزدیک ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس میں کچھ پرانی کتابیں درس سے خارج اور آن کی جگہ نئی کتابیں درس میں داخل ہوتی رہا کریں ۔ اس سے دو فائدے متصور ہیں ؛ ایک یہ کہ ان متواتر تبدیلیوں سے اسلام کے بڑے بڑے نام ور اور جلیل القدر مصنفوں کی کتابیں قوم میں شائع ہوتی رہیں گی اور آن کا نام زندہ ہوتا رہے گا ۔ اول تو زمانے کے انقلاب سے مسلمانوں کے کتب خانے برباد ہو گئے ۔ جو شہر مسلمانوں کے دارالعلم تھے آن میں ایک بھی قدیم کتب خانہ باقی نہیں رہا ۔ اور اگر بالفرض وہ سب کتب خانے قائم بھی رہتے یا اب ویسے ہی کتب خانے پھر قائم ہو جائیں ، تو بھی قدیم مصنفوں کا نام صرف کتب خانوں سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ آن کی تصنیفات کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے سے زندہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو علوم و فنون ہمارے سلسلۂ درس میں بالکل داخل نہ تھے آن کی مستند کتابیں ہندوستان میں بہت کم پہنچیں ۔ زیادہ تر وہی کتابیں

شائع ہوئیں جو سلسلۂ درس میں شامل ہوگئی ہیں ۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے علما جو مدارسِ اسلامیہ میں درس دیتے ہیں وہ معمولی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے اُکتا جاتے ہیں اور اُن کو درس و تدریس کے مشغلے میں سلسلۂ درس کے علاوہ اور کتابیں مطالعہ کرنے کا موقع ملنا دشوار ہوتا ہے ۔ اس ترمیم اور تبدیلی سے اُن کو ہمیشہ نئی نئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملے گا اور اُن کے علم و فضل کو نہایت ترقی ہوگی ۔

درسی کتابیں ، جیسا کہ سب اہل علم جانتے ہیں ، اس لیے ہرگز نہیں مقرر کی جاتیں کہ وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہوتی ہیں اور اُن کے پڑھنے کے بعد اور کسی کتاب کے مطالعے کی ضرورت نہیں رہتی ، بلکہ اس لیے مقرر کی جاتی ہیں کہ اُن کے پڑھ لینے سے طالب علم کو ہر علم کے ساتھ فی‌الجملہ مناسبت اور اُس کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے جس کے سبب سے وہ ہر علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب بغیر اُستاد کی اعانت کے سمجھ سکے ۔

ہمارے ہاں جتنے طلبہ فارغ‌التحصیل ہوتے ہیں ، اگر تحصیل کے بعد ان پر افکارِ دنیوی غالب نہ آئے اور ان کو کتب بینی کا شوق باقی رہا تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو علمی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ اگر ان کو درسی کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کے دیکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے تو درس و تدریس کے مشاغل میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کسی نئی کتاب کا مطالعہ کر سکیں ۔ پس سوا اس کے کہ درسی کتابیں ان کو خوب ازبر ہو جاتی ہیں اور ان کے تمام مالہ و ماعلیہ پر عبور ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی نئی اطلاعیں ، جو آج کل کے جدید تراجم اور مفید تصنیفات میں موجود ہیں ، ان کو حاصل نہیں ہوتیں ۔ ہر علم اور ہر فن میں ان کو صرف انھی چند

مصنفوں کی رائیں معلوم ہوتی ہیں جن کی کتابیں سلسلۂ درس میں قدیم سے چلی آتی ہیں ۔ گویا ایک دریائے زخار میں سے چند قطروں پر قانع ہو جاتے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس حالت سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ، بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ کا انجام یہی ہوتا ہے ۔ جب کہ یہ حال ہے تو سلسلۂ درس کا کبھی کبھی تبدیل ہونا خاص کر مدرّسین کے حق میں نہایت مفید ہوگا ، اور ان کو نئی باتوں ، نئے تجربوں ، نئی رایوں اور نئی حالتوں پر اطلاع یابی کا موقع ملے گا ۔

جو کچھ کہ اوپر بیان کیا گیا ، یہ تو اُس صورت میں ہے کہ معمولی سلسلۂ درس سراسر مناسب اور مفید ہو ۔ پس در صورتیکہ سلسلۂ مذکور کا ایسا حال نہ ہو ، وہ بالضرور ترامیم اور اصلاح کا محتاج ہوگا ۔ میرے نزدیک موجودہ سلسلۂ درس نہایت نامکمل اور غیر مفید ہے ۔ میں اس وقت وہ تمام باتیں پیش کرنی نہیں چاہتا جو اصلاح طلب ہیں ۔ چند باتیں اس موقع پر عرض کرتا ہوں ۔ اگر اُن پر غور اور توجہ کی گئی تو اور مراتب بھی کسی دوسرے موقع پر عرض کیے جائیں گے ۔

سب سے بڑا قصور ہمارے طریقۂ درس و تدریس میں یہ ہے کہ صرف و نحو کے ساتھ عربی زبان کے بولنے اور لکھنے کی مشق نہیں کرائی جاتی ۔ یہ بعینہ ایسی بات ہے کہ معمار اپنے شاگردوں کو معماری کے قاعدے زبانی یاد کرائے اور اُن سے کبھی تعمیر کا کام نہ لے ، یا باورچی کھانا پکانے کی ترکیبیں زبانی یاد کر لے اور کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہ پکائے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ ، جو معقول اور منقول کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی درسی کتابیں نہایت عمدگی سے پڑھا سکتے ہیں ، وہ عربی زبان کے بولنے اور عربی عبارت کے

انشا کرنے سے بالکل عاجز ہوتے ہیں۔ اور چوں کہ اُن کو ابتدا سے لکھنے کی عادت نہیں ڈالی جاتی اس واسطے وہ جس طرح عربی عبارت کے انشا پر قادر نہیں ہوتے اُسی طرح فارسی بلکہ اُردو لکھنے پر بھی، جیسا کہ چاہیے ، قدرت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ ہر سال اسلامی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اُن میں کوئی مصنف یا مؤلف یا مترجم پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری قوم میں جس قدر لائق مدرّسوں کی ضرورت ہے اُس سے زائد لائق مصنفوں کی ضرورت ہے۔ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنا ایک عربی داں فاضل کا سب سے زیادہ سہل اور آسان کام معلوم ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسا سہل کام بھی اُن سے سرانجام نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کا کوئی ترجمہ آج ایسا موجود نہیں ہے جس سے اُس کا مطلب صاف صاف ہر شخص کی سمجھ میں آ سکے۔ صرف ایک ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو اُس وقت کیا گیا تھا جب کہ اُردو زبان نہایت ابتدائی حالت میں تھی۔ اُس وقت کے سینکڑوں محاورے اور الفاظ متروک ہو گئے ہیں اور اس لیے اب وہ ترجمہ اکثر مقامات سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر فارغ التحصیل فاضلوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس ضروری کام کو سرانجام کرے اور قرآن مجید کا عام فہم اور خاص پسند ترجمہ کرکے مسلمانوں میں شائع کرے۔ یورپ میں کم سے کم بیس ترجمے قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں اب تک ہو چکے ہیں، اور ہمیشہ پانچ چار برس کے بعد ایک نیا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔

عیسائی قومیں تو قرآن مجید کی طرف اس قدر متوجہ ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ترجمہ ، جو اب سے سو برس پہلے ہوا تھا ، وہی آج تک چلا آتا ہے۔ اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمارے اسلامی مدرسوں میں تصنیف اور تالیف اور ترجمہ کرنے کی لیاقت طالب علموں میں نہیں پیدا کی جاتی۔

پس میرے نزدیک ایک یہ ضروری بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے عربی جملوں اور فقروں کے عربِ عرباء کے کلام سے انتخاب کرکے بنائے جائیں ، جو ابتدائے تعلیم سے صرف و نحو کے ساتھ پڑھائے جایا کریں۔ اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق طلبہ کو اول ہی سے شروع کرائی جائے، تاکہ صرف و نحو کے قواعد بھی اُن کے دلوں پر نقش ہوں ، اور عربی زبان میں گفتگو کرنے اور عربی عبارت لکھنے کا ملکہ بھی اُن میں پیدا ہو۔ اور جب تک کتبِ درسیہ کا سلسلہ ختم نہ ہو، ہر درجے میں اُس درجے کی حیثیت کے موافق ادب کی کتابوں کا برابر درس جاری رہے۔ چوں کہ اس قسم کی کتابیں اور رسالے ہمارے معمولی سلسلۂ درس میں بالکل موجود نہیں ہیں ، اس واسطے ضرور ہے کہ ایسی کتابیں عربِ عرباء کے کلام سے انتخاب کرکے چند علماء کے مشورے اور اتفاق سے ہر درجے کے موافق بنوائی جائیں۔

اب تک ہمارے ہاں ادب کی تعلیم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب طالب علم منتہی ہونے کے قریب پہنچتا ہے ، اُس وقت بعض اُستاد اس کو دفعۃً ادب کی نہایت مغلق اور مشکل کتابیں جیسے متنبی ، حماسہ ، سبعہٴ معلقہ ، مقاماتِ حریری وغیرہ پڑھانا شروع کر دیتے ہیں ، مگر لکھنے کی اب بھی مشق نہیں کرائی جاتی۔ چوں کہ طالب علم ابتدا سے عربیت سے اجنبی ہوتے ہیں ، جب دفعۃً ایک غریب و غیرمانوس نظم یا نثر اُن کے سامنے آتی ہے تو بعض اوقات ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یا تو یہ عربی زبان نہیں اور یا جس زبان میں ہم نے اب تک کتابیں پڑھی ہیں ، وہ عربی زبان نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ اُن کو ان عربی کتابوں سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس فن سے ایسی ہی مناسبت ہوئی تو اس کو

صرف اُس وقت فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کتابوں کو اُسی طرح جس طرح کہ استاد نے اُس کو پڑھایا ہے، اوروں کو پڑھانے کے قابل ہو جاتا ہے، مگر انشا کرنے پر اُس کو کچھ قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ (الاماشاء اللہ)

ادب کی تعلیم کا ایک نہایت جلیل القدر فائدہ یہ ہے کہ جس قدر ادب سے زیادہ مناسبت پیدا ہوگی، اُسی قدر قرآن و حدیث کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اور نظمِ قرآن کی عظمت اور جلالتِ شان نہ محض حسنِ عقیدت سے بلکہ اذعانِ قلب اور جزم و یقین کے ساتھ دل میں متمکن ہوگی اور قرآن کے وجوہِ اعجاز بیان کرنے پر قدرت حاصل ہوگی۔

دوسری بات جس سے اسلامی مدرسوں میں اب تک ابتدائی تعلیم کے متعلق غفلت کی گئی، یہ ہے کہ فارسی یا اُردو کو سہل یا ذلیل سمجھ کر اُن کی طرف مطلق اعتنا نہیں کیا گیا۔ بعض مدارس میں صرف اس قدر انتظام ہے کہ جو طالبِ علم عربی پڑھنا نہیں چاہتے اُن کے لیے ایک آدھ مدرّس فارسی سکھانے کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ مگر جو طلبہ عربی زبان میں تحصیل کرتے ہیں اُن کو، جہاں تک کہ میں واقف ہوں، فارسی اور اُردو سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بڑی غلطی ہے۔ فارسی زبان کی اگر تکمیل نہ کرائی جائے تو کم سے کم فارسی کی ادنیٰ اور اوسط درجے کی کتابیں ضرور سلسلۂ درس میں داخل کرنی چاہئیں۔ اور اُردو زبان میں اگر اور کچھ نہیں تو اس کی انشا اور املا کی ضرور مشق کرانی چاہیے۔

فارسی زبان کی تعلیم کو میں صرف اسی لیے ضروری نہیں کہتا کہ اُس سے اُردو زبان کی تکمیل میں مدد ملتی ہے، بلکہ اس لیے بھی اس کی ضرورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بزرگوں کی نشانی ہے اور اس لیے اس کو قائم رکھنا اور اُس سے مناسبت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے سوا ہماری اکثر مذہبی، تاریخی، اخلاق اور علمی کتابیں فارسی زبان میں ہیں، اس لیے بھی ہمارے فضلا کو مناسب نہیں ہے کہ اُس سے بالکل اجنبی اور نا آشنا رہیں۔

یہ خیال کرنا کہ عربی زبان سیکھنے سے فارسی اور اُردو دونوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر انشا کرنے کی پوری مشق طلبہ کو کرائی جائے تو ممکن ہے کہ اُن کو اُردو لکھنے میں کسی قدر مدد ملے۔ لیکن اُردو انشا پردازی میں فاضلانہ لیاقت، جس کی کہ ضرورت ہے، ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ رہی فارسی، سو وہ خود ایک علیحدہ اور مستقل زبان ہے۔ اور ہماری مادری زبان بھی مثل اُردو کے نہیں ہے، وہ عربی سیکھنے سے کیوں کر آ سکتی ہے۔ اُردو زبان، جس میں ہزاروں لفظ ہندی بھاشا کے ہیں، جب اُن کے جاننے سے ہم کو ہندی بھاشا نہیں آتی تو عربی جاننے سے فارسی (صرف اس وجہ سے کہ اُس میں بہت سے عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں) کیوں کر آ سکتی ہے؟

تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ ہمارا معمولی سلسلۂ درس تاریخ اور جغرافیے سے بالکل معرّا ہے، حالاں کہ تاریخ اور جغرافیہ اُن فنون میں سے ہیں جن کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے اول مسلمانوں نے ترقی دی ہے اور اپنے زمانے کے موافق اُن کو کمال کے درجے تک پہنچایا ہے۔ تاریخ کے درس میں داخل نہ ہونے سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فن تاریخ سے بالکل مناسبت نہیں رہی۔ یہاں بے علموں اور ان پڑھ آدمیوں کا ذکر نہیں ہے، خود ہمارے اکثر علماء و فضلا، اسلام کے اُن تمام مہتم بالشان واقعات سے بالکل بے خبر ہیں جن کو آج تک مغربی قومیں حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ قطع نظر مسلمانوں کی ملکی فتوحات اور علمی

ترقیات کے جو خلافتِ راشدہ میں یا اُس کے بعد ظہور میں آئیں ، خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانِ برکت نشان کے حالات سے بہت ہی کم اطلاع رکھتے ہیں ۔ علمِ انساب اور علمِ رجال صرف کتابوں میں رہ گیا ہے ۔ جو قومیں آج اپنے تئیں تمام علوم و فنون میں ساری دنیا سے افضل اور برتر سمجھتی ہیں ، وہ علانیہ اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ ہماری تمام علمی و عملی ترقیات کا ماخذ مسلمانوں کے علوم و فنون تھے ۔ مگر ہم کو مطلق خبر نہیں کہ ہم کیا چیز تھے اور ہمارے بزرگوں نے علم وحکمت کو کس درجے تک پہنچایا تھا ۔ جغرافیے میں مسلمانوں کی تحقیقات کو آج تک غیر قومیں نہایت عزت کی نظر سے دیکھتی ہیں ۔ جغرافیے میں اُن کی بے مثل تصنیفات اس قابل ہیں کہ اُن پر فخر کر سکتے ہیں ، اور یورپ کی قومیں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپواتی اور شائع کرتی ہیں ۔ مگر ہمارے اسلامی مدرسوں میں ان کا نام تک کوئی نہیں جانتا ۔ ہمارے علمِ ادب میں ، حدیث میں ، قرآن میں ہزاروں نام امصار و قریٰ و اماکن و مواضع کے آتے ہیں ، مگر طالب علموں کو سوا اس کے کہ یہ کسی شہر یا مقام کا نام ہے ، اُن کی نسبت اور کچھ نہیں بتایا جاتا ۔ حالاں کہ بہت سے مقامات احادیث وغیرہ میں ایسے آ جاتے ہیں کہ جب تک اُن کا محل اور موقع اور مفصل حال معلوم نہ ہو ، عبارت کا مطلب ہر گز ذہن نشین نہیں ہو سکتا ۔ بہت سے مقامات قرآن ، انجیل اور توریت میں ایسے ہیں کہ جب تک اُن کا موقع اور محل معین نہ کیا جائے ، تب تک مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید نہیں کی جا سکتی ۔ اسی طرح جغرافیہ اور نیز تاریخ کے جاننے سے اور بے شمار فائدے متصور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے ۔

ہمارے علما نے ظاہرا سلسلۂ درس کے مقرر کرنے میں اس

بات کا بہت لحاظ رکھا تھا کہ جو فن نہایت آسان ہیں اور جن کو مستعد طالب العلم اپنی قوتِ مطالعہ سے نکال سکتے ہیں ، اُن کو سلسلۂ درس میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تاریخ اور جغرافیے سے بھی اسی بنا پر قطع نظر کی گئی ہو ۔ لیکن فی الواقعہ یہ خیال صحیح نہیں تھا ؛ اول تو آسان سے آسان مضمون ، جب اُس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو نہایت مشکل مضمون ہو جاتا ہے ۔ اور مشکل سے مشکل مضمون پر جب زیادہ غور اور توجہ کی جاتی ہے تو آسان ہو جاتا ہے ۔ گویا ذیل کے مشہور شعر میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

مشکل ز توجہِ تو آسان
آساں ز تغافلِ تو مشکل

لغت کی کتاب سے لغت نکالنا طالب العلم کا سب سے زیادہ آسان کام ہے ، مگر ہمارے اکثر طلبہ عدمِ ممارست کے سبب صُراح و قاموس وغیرہ سے لغت بہت کم نکال سکتے ہیں ۔ حساب کے ابتدائی قاعدوں کے سوالات انگریزی مدرسوں کے مبتدی نہایت آسانی سے نکال دیتے ہیں اور ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں ۔ تاریخ اور جغرافیے کو اگر فرض کر لیا جائے تو وہ فی الواقعہ نہایت آسان فن ہیں ، تو بھی اُن کی طرف سے بے اعتنائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء کو تاریخ اور جغرافیے سے بالکل مناسبت نہیں رہی ۔

دوسرے ، تاریخ کو یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ نہایت آسان فن ہے ۔ بے شک مسلمانوں نے جب اول ہی اول تاریخ لکھنی شروع کی تھی ، اُس وقت وہ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اور اس لیے نہایت آسان معلوم ہوتی تھی ۔ مگر اب وہ ایسا دقیق فن ہو گیا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ دونوں ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں ۔ خود بعض مسلمان عالموں کی ایسی تاریخی تحقیقاتیں موجود ہیں جو کسی

طرح فلسفے سے کم رتبہ نہیں رکھتیں ۔ منطق کے اصول انسان کی معمولی بول چال سے استنباط کیے گئے ہیں ، گویا منطق کی ابتدائی حالت انسان کی معمولی بول چال تھی ۔ لیکن اب وہ نظر اور فکر کے عمدہ نتائج کا ایک نہایت عمیق اور دقیق فن سمجھا جاتا ہے ۔ اسی طرح تاریخ ابتدائی حالت میں کیسی ہی آسان ہو لیکن اب وہ فلسفے کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی ہے ۔ جغرافیے کا حال بھی تاریخ ہی کے قریب قریب ہے ۔ مسلمانوں نے صرف ملکی جغرافیہ لکھا تھا اور وہ فی الواقعہ نہایت آسان تھا ، لیکن اب جغرافیے میں بعض قسمیں ایسی اضافہ ہوئی ہیں جو فلسفے اور حکمت میں داخل سمجھی جاتی ہیں ۔

بہر حال میرے نزدیک کم سے کم ابتدائی جماعتوں کے لیے کسی قدر عربی جغرافیوں کا انتخاب اور کل جماعتوں کے لیے ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق عربی تاریخوں کے انتخابات بھی سلسلۂ درس میں ضرور اضافہ کرنے چاہئیں ۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہے ، وہ یہ ہے کہ ریاضی کو ہمارے سلسلۂ درس میں بہت ہی کم حصہ دیا گیا ہے ۔ جبر و مقابلہ کو مسلمانوں کے ساتھ وہ خصوصیت ہے کہ بعضوں نے اُس کو خاص مسلمانوں ہی کی ایجاد قرار دیا ہے ۔ ہندسہ جو آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے ، وہ بالاتفاق 'تحریر اقلیدس' کے اُس ترجمے کی بدولت پھیلا ہے جو محقق طوسی نے عربی زبان میں کیا تھا ۔ اقلیدس کی یونانی تحریر دنیا سے مفقود ہو گئی تھی ، صرف محقق کا ترجمہ باقی تھا ۔ اول اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور پھر رفتہ رفتہ تمام یورپ کی زبانوں میں لکھا گیا ۔ ہیئت میں مسلمانوں کی ترقی کو تمام یورپ نے تسلیم کیا ہے ۔ چناں چہ ستاروں کے بے شمار عربی نام آج تک یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں ۔ علمِ مناظر اور مرایا میں جو نہایت مہتم بالشان مسئلے مسلمانوں نے حل کیے تھے ، اُن میں سے ایک وہ تھا جس کی بنیاد پر زمانۂ حال میں عکسی تصویر کا حیرت انگیز فن ایجاد ہوا ۔ جرِّ ثقیل میں جو آج کل بے انتہا ترقی ہوئی ہے ، اُس کے بڑے بڑے اصول مسلمانوں ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں ۔ غرض کہ ریاضی کی تمام فروع میں مسلمانوں نے اپنے زمانے کے موافق انتہا درجے کی ترقی کی تھی ۔ باوجود اس کے ہم نے ریاضی سے مطلق سروکار نہیں رکھا ، یہاں تک کہ ریاضی سے مسلمانوں کی نامناسبت اس زمانے میں ضرب المثل ہو گئی ہے ۔ جہاں تک کہ مجھ کو معلوم ہے ، اکثر اسلامی مدارس میں تو ریاضی کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی ۔ حساب ، ہندسہ ، جبر و مقابلہ ، ہیئت ، علم مثلث ، مناظر و مرایا ، غرض کہ کوئی فرع سلسلۂ درس میں داخل نہیں ہے ۔ مگر سنا جاتا ہے کہ بعض مدارس میں صرف 'خلاصۃ الحساب' حساب میں ، 'تشریح الافلاک' اور 'شرح چغمینی' ہیئت میں اور کہیں کہیں چند مقالے 'تحریر اقلیدس' کے ہندسے میں پڑھائے جاتے ہیں ۔

جو لوگ مدارسِ اسلامیہ کو ترقی دینا اور مفید بنانا چاہتے ہیں ، اُن کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، سلسلۂ درس میں ریاضی کے جو نہایت ضروری فروع ہیں ، اُن کی مفید کتابیں علماء کے مشورے سے داخل کریں اور ہیئتِ جدید کی کتابیں جو غالباً مصر میں ضرور لکھی اور چھاپی گئی ہوں گی ، اگر ہم پہنچیں تو اُن کو بھی وہاں سے طلب کرکے درس میں شامل کریں تاکہ دونوں ہیئتوں کے مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور اُن میں سے جو ہیئت غلط ثابت ہو اُس کو ترک کریں اور جو ہیئت صحیح ہو اُس پر اپنے علم کی بنیاد رکھیں ۔

ہیئتِ جدید کو یہ سمجھ کر کہ وہ نصوصِ قرآنی کے خلاف ہے ، ترک کرنا اور اُس سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کرنا

گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ دینِ اسلام اس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا ۔ جو لوگ دینِ اسلام کو دینِ برحق اور خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں ، ان کا یہ اعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر ہیئتِ جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصولِ اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتی اور اگر وہ اصولِ اسلام کے خلاف ہے تو یقیناً جھوٹی ہے ، اور ہم ضرور اس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کر سکیں گے ۔ لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ وہ غلط ہے یا صحیح ، یا اصول اسلام کے خلاف ہے یا نہیں ، ضرور ہے کہ اول اس کا علم حاصل کیا جائے ۔ حکمتِ یونانیہ جو صدہا سال سے ہمارے ہاں درس میں داخل چلی آتی ہے ، اس میں بہت سے مسئلے اب تک ایسے موجود ہیں جو عقائدِ اہل اسلام کے خلاف سمجھے جاتے ہیں ۔ باوجود اس کے اس کو کورس میں داخل رکھا گیا ہے ، کیوں کہ جب وہ مسائل اور ان کے جوابات جو ہمارے علمائے متکلمین نے دیے ہیں ، ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں تو ان مسائل کی غلطی طلبہ کے خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح ہیئتِ جدید کو بھی درس میں داخل کرنا چاہیے تاکہ اگر وہ فی الواقعہ اصولِ اسلام کے خلاف ہو تو ہمارے علماء کو اس کے رد کرنے کا موقع ملے ۔

یہ باتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ خواہ نخواہ ان کے موافق عمل درآمد کیا جائے ، بلکہ یہ غرض ہے کہ ان کو غور سے سنا جائے اور اگر کوئی بات تسلیم کرنے کے قابل ہو تو اس کے موافق یا اس میں کمی بیشی کرنے کے بعد عمل درآمد کیا جائے ۔

٦

تقریر متعلق مجوّزہ مسلم یونیورسٹی

(رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس متعلق اجلاس دوازدہم
مطبوعہ ۱۸۹۹ع ، صفحہ ۱۴۸ تا ۱۷۰)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں اجلاس ، جو لاہور میں دسمبر ۱۸۹۸ع میں منعقد ہوا تھا ، ہمیشہ اس بات کے لیے مشہور رہے گا کہ موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ قائم کرنے کی سب سے پہلی تجویز کانفرنس کے اسی اجلاس میں پیش کی گئی تھی ۔ یہ اجلاس کانفرنس کا نہایت اہم اجلاس تھا اور بڑے بڑے لوگوں نے یونیورسٹی کے قیام اور اجرا کے متعلق اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ اور جو لوگ کسی وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہو سکے انھوں نے خطوط کے ذریعے اپنی رائیں اس مسئلے کے متعلق سکریٹری کانفرنس کو لکھ کر بھیجیں ۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے مسٹر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج نے اس مضمون کا ریزولیوشن پیش کیا تھا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ یونیورسٹی کا قائم ہونا مستحسن ہے" ۔ اس ریزولیوشن کی تائید میں جس قدر تقریریں ہوئیں اور جس قدر تحریرات اور خطوط وغیرہ

> اس کے متعلق دفتر کانفرنس میں آئے ، کانفرنس نے وہ سب اُسی زمانے میں چھاپ کر شائع کر دیے تھے ۔
>
> نواب محسن الملک نے مولانا حالی کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی اور نہایت آرزو ظاہر کی تھی کہ تشریف لا کر اس مسئلے کے متعلق اپنی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں ۔ مولانا کا بھی مصمم ارادہ تھا کہ خود لاہور جائیں مگر اچانک بیمار ہو جانے کے باعث اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا ۔ جب مولانا کے شریک اجلاس ہونے کی کوئی توقع نہ رہی تو ناچار محسن الملک نے نہایت اصرار سے آپ کی خدمت میں لکھا کہ اب جب کہ آپ کی بذات خود شمولیت کی کوئی امید نہیں رہی تو اپنی تقریر ہی لکھ کر یا لکھوا کر بھیج دیں جس سے آپ کے قیمتی خیالات اس مسئلے کے متعلق حاضرین معلوم کر سکیں ۔ چناں چہ یہ وہی تقریر ہے جو مولانا نے لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجی تھی اور محسن الملک نے اُس کو ۳۱ دسمبر ۱۸۹۸ع کے اجلاسِ لاہور میں پڑھ کر سنایا تھا ۔
>
> (محمد اسماعیل)

صاحبو ! یہ ریزولیوشن جس کی تحریک کرنے کی مجھے عزت دی گئی ہے ، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی ریزولیوشن آج تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں پیش نہیں ہوا ۔ غالباً آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ سرسید مرحوم نے جب ولایت سے واپس آکر مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی ، اُس وقت اُن کا ارادہ بجائے محمڈن کالج کے ، جو اُنھوں نے قائم کیا ، در حقیقت

ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا ۔ چناں چہ جو اسکیم آنریبل سید محمود نے ۱۰ - فروری ۱۸۷۳ع کو کالج فنڈ کمیٹی میں پیش کی تھی ، اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے ۔ اور اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا گیا تھا ۔ مگر گورنمنٹ شمال مغرب نے اس لحاظ سے کہ اُس وقت کمیٹی کی ابتدائی حالت تھی اور اُس کی آئندہ کارروائیوں پر کسی طرح اطمینان نہیں ہو سکتا تھا ، کمیٹی کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر وہ محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ ِان ایڈ نہیں دے گی ۔ باوجود اس کے بھی سرسید کا ارادہ مدت تک یہی رہا کہ محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے اور گورنمنٹ کی امداد سے بالکل قطع نظر کی جاوے ۔ مگر چوں کہ بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے یونیورسٹی قائم کرنے میں بےشمار مشکلات کا سامنا تھا اس لیے اُنھوں نے آخر کار محمڈن کالج قائم کرنے پر قناعت کی ۔ مگر ۲۶ برس کے عرصے میں محمڈن کالج نے توقع سے زیادہ ترقی کی ہے اور گورنمنٹ کی نظر میں بہت کچھ اعتبار پیدا کر لیا ہے ، اس لیے جیسا کہ تھیوڈور ماریسن اسکوائر نے ایک موقع پر پچھلے دنوں میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا ، کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو ، جو اپنی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینا اور گورنمنٹ کو اس بوجھ سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں ، مجوزہ یونیورسٹی قائم کرنے سے مانع آئے گی ۔

پس جو ریزولیوشن اس وقت پیش ہوا ہے اگر مسلمانوں کی متفقہ کوشش سے یہ تجویز پوری ہوگئی تو اُن کو ایک ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوگی جو اُن کے بزرگ لیڈر سرسید مرحوم

کو باوجود چالیس برس کی لگاتار کوشش کے اپنی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی ، یہاں تک کہ اس تمنا کو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ۔ اور دنیا پر روشن ہو جائے گا کہ اُس مرحوم نے جو بیج مسلمانوں میں فوقیت کا بویا تھا وہ اکارت نہیں کیا گیا ۔

مگر میں اس ریزولیوشن کو صرف اسی وجہ سے ضروری نہیں سمجھتا ، بلکہ میں زیادہ تر اس سبب سے اُس کو ضروری خیال کرتا ہوں کہ اُس میں محمڈن یونیورسٹی ، اُس شخص کی یادگار میں قائم کرنی تجویز ہوئی ہے جو چند روز میں ہم کو اس قابل بنا گیا ہے کہ اپنے قومی کالج کو یونیورسٹی بنانے کا حوصلہ ہم میں پیدا ہوا ہے ۔

صاحبو ! یہ کچھ کم تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ جو قوم بیس پچیس برس پہلے انگریزی تعلیم کو برہم زنِ دین و مذہب خیال کرتی تھی ، اُس کی اشاعت کے لیے چندہ دینے کو گناہ و معصیت جانتی تھی اور اُس کے حامیوں کو کافر و ملحد، قرار دیتی تھی ، اُس قوم میں ایک با رُعب جماعت ایسی پیدا ہوجائے جو انگریزی تعلیم کے لیے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو ۔ پُرانے خیالات اور خاص کر وہ خیالات جو مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں ، اُن کا بدلنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ۔ پس وہ کیسی زبردست قوت ہوگی جس نے اس قدر جلد مسلمانوں کے خیالات میں یہ تبدیلی کردی ۔

اے زندہ دلانِ پنجاب ! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ نے آنکھ کھول کر روشنی ہی روشنی دیکھی ہے ، اور اس لیے تعصبات کی وہ گھنگھور گھٹا ، جو دلی سے لکھنؤ تک تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اور بہت کچھ اب تک چھائی ہوئی ہے ، اُس کا شاید پورا پورا اندازہ آپ نہیں کر سکتے ۔ ہم نے وہ تعصبات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور اب تک دیکھتے ہیں ۔ اور خود ہم نے اُنھی

تعصبات کے بھونرے میں نشو و نما پائی ہے جو بلامبالغہ اس آیت کے مضمون کا مصداق تھا : ”او کظلمت فی بحر لجی یغشٰہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضھا فوق بعض “ ۔ مگر کسی بزرگ کا قول ہے ”کم نکبۃ للہ فیھا رحمۃ“ (یعنی اکثر بدبختیوں میں خدا کی رحمت چھپی ہوئی ہوتی ہے) ۔ وہی تاریکی جو ہم پر چھائی ہوئی تھی ، ہمارے لیے روشنی کا فرشتہ بن گئی ۔ وہی دارالخلافہ جو مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا مرکز اور مذہبی تعصبات کا سرچشمہ تھا ، اُس کی خاک سے ایک ایسا شخص اُٹھا جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ، اور آخر وہ فتحِ نمایاں حاصل کی جس کا ظہور ہم اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں ، کہ جس تعلیم کے نام سے ہم سو سو کوس بھاگتے تھے ، آج اُسی تعلیم کے لیے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اور جس شخص کو کافر و ملحد کہتے تھے اُس کی شکر گزاری میں یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں ۔

صاحبو ! یہ انقلابِ عظیم جو ہمارے خیالات میں پیدا ہوا ہے اور ہماری تمام آئندہ ترقیات کی جڑ ہے ، اس کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہیے ۔ ایک لڑکا جو راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے ، اُس کے خیالات کی اصلاح میں والدین کی تمام عمر گزر جاتی ہے اور وہ ہرگز راہ پر نہیں آتا ۔ پھر جس شخص نے بیس پچیس برس کے عرصے میں لاکھوں کے خیالات بدل دیے اور کروڑوں کو چوکنا کر دیا ، اُس کو دیکھنا چاہیے کہ اس منزل میں کیا کیا دشواریاں پیش آئی ہوں گی اور کیسے کیسے سخت مرحلے طے کرنے پڑے ہوں گے ۔ وہ کس دل و دماغ کا انسان ہوگا اور اُس کی ہمت اور اُس کا استقلال کس درجے کا ہوگا ۔

افسوس ہے کہ وقت میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ سرسید کی زندگی کے واقعات مختصر طور پر بھی اس جلسے میں بیان کر سکوں ۔

اور چوں کہ ان کی لائف عنقریب پبلک میں شائع ہونے والی ہے اس لیے میں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں سمجھتا ۔

لیکن اے صاحبو ! اگر آپ مجھ کو اجازت دیں تو میں اس موقع پر چند نتائج اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے بیان کروں جس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اُس مرحوم کی کوششوں سے ہم نے کیا کیا فائدے اٹھائے ہیں اور کہاں تک اُس کی شکرگزاری ہمارے ذمے واجب ہے ۔

صاحبو ! اگرچہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصۂ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا ، اُن کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں ۔ علم میں ، دولت میں ، اخلاق میں ، درجے میں وہ اپنی ہم وطن قوموں سے گرتے جاتے تھے مگر یہ پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا ۔ دفعتاً ۱۸۵۷ع کے غدر کی آندھی آٹھی جس نے اُس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا ۔ یکایک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہو گئی ۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام و نمود رکھتے تھے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئے ، اور ہزاروں معرکۂ بغاوت میں مارے گئے ، اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لیے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں ، ہزاروں اپنا وطن اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے ، اور جو باقی رہے اُن کا یہ حال تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں ۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں ، ہزاروں بچے یتیم ہو گئے ، گھر چھن گئے ، جائدادیں ضبط ہوگئیں ، بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہو کر تکیوں میں جا بیٹھے ، بہت سے بھیک مانگتے پھرتے تھے ، باورچی گری اور خدمت گاری کرتے تھے ، مشکیں اٹھاتے تھے ، گاڑیاں ہانکتے تھے ۔

خیر یہ مصیبتیں تو ہمیشہ تھیں کہ ہمیشہ لڑائی کے ہنگاموں کے بعد اہل ملک کو بھگتنی پڑتی ہیں ، مگر مسلمانوں کو سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ جہاں تک نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے ، اُن کو مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی ۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے زمانۂ مستقبل کو زیادہ خوف ناک پاتے تھے ۔ اُن کو ہندوستان میں رہنا ایسا ہی مشکل ہوگیا تھا جیسے دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر ۔ مسلمان عموماً بہ حیثیت قومی و مذہبی انگلش گورنمنٹ کے مخالف سمجھ لیے گئے تھے ۔ حکام کی نظر میں ان کا اعتبار ہی نہیں جاتا رہا تھا ، بلکہ وہ سلطنت کے حق میں اور ملک کے امن اور انتظام کے حق میں ایک خطرناک فرقہ سمجھا جاتا تھا ۔ مسلمانوں کی بدبختی ہندوستان کی اور قوموں کے لیے پناہ بن گئی تھی اور بقول سرسید کے ہر ایک جرم اور ہر ایک الزام کا بوجھ اس بدنام قوم کے سر پر دھرا جاتا تھا ۔ غرضے کہ حکام کی بدظنی اور نفرت کی کوئی حد باقی نہ رہی تھی ۔ کسی شخص کا صرف مسلمان ہونا ہی اُس کو بدتر سے بدتر جرم کا مرتکب ٹھہرانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا اور یہ نفرت اور بدظنی تمام انگلش نیشن میں سرایت کر گئی تھی ۔ تمام اینگلو انڈین اخبار اور ولایت کے اخبار مسلمانوں کے برخلاف اشتعال پیدا کرنے والے آرٹیکل لکھتے تھے اور انگریزوں کے دل میں عموماً عداوت اور نفرت کا بیج بوتے تھے ۔ گویا مسلمانوں کو نہ ان انگریزوں سے جو ہندوستان میں حکم راں تھے اور نہ اُن سے جو ہر سال ولایت سے مختلف خدمات پر مامور ہو کر آتے تھے ، کوئی اُمید باقی رہی تھی ۔ اور اُن کے حال پر یہ شعر صادق آتا تھا ۔ شعر

اکنوں اگر فرشتہ نکو گویدت چہ سود
در شہر صد حکایت بدنامئی تو رفت

اگرچہ انگریزوں کی یہ نفرت اور بدگمانی ، جیسا کہ سرسید مرحوم نے رسالۂ 'اسبابِ بغاوت' اور ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں ثابت کیا ہے ۔

اور جس کو بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے آخر کار تسلیم کر لیا ہے ، محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا ۔ مگر بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے کہ ان غلط فہمیوں کا ہونا نہایت قرین قیاس تھا ۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت ، طبیعت ، اُن کی حالت اور اُن کے طرزِ حیات سے ناواقف تھے ۔ ملک کی حکومت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور اُن ہی کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا دعوے دار سمجھتے تھے ۔ اور بقول سرسید کے اُن کے اس خیال کی تائید کے لیے ”بُھس بھری ہوئی مردہ کھال دلی کے قلعے میں موجود تھی“۔ مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی دھوم تھی اور اُن میں سے بعض جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگ اپنی وحشیانہ حرکتوں سے ان تعصبات کا کاف ثبوت دے چکے تھے ، اور چند مچھلیاں سارے تالاب کو گندہ کر چکی تھیں ۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ تمام مسلمان من حیث القوم انگریزوں کی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں ۔

پس کیا انگریز ، کیا ہندو اور کیا مسلمان ، کسی سے اس نازک وقت میں یہ امید نہ تھی کہ اس پانچ کروڑ مخلوق کے بیڑے کو اس طوفانِ عظیم کے صدمے سے بچائے ۔ مگر خدا مسلمانوں کے ساتھ تھا ۔ اُس نے جہاں کوئی بیماری پیدا کی ہے ، وہیں اُس کی دوا بھی پیدا کی ہے ۔ وہی مغضوب و معتوب شہر جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ موردِ آفات تھے اور جس پر اگر خدا کا رحم لارڈ لارنس مرحوم کے قالب میں ظہور نہ کرتا تو اُس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ؛ اُسی شہر کے مسلمانوں میں سے ایک شخص اٹھا جس نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان کی تمام رعایا کو عام بغاوت اور عام سازش اور گورنمنٹ کی عام مخالفت کے الزام سے بری کیا ۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے تسلیم کر لیا کہ ۱۸۵۷ع کا غدر کسی ملکی سازش یا عام بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ

۱۰۳۹۶

صرف سپاہ کی جہالت اور مذہبی توہمات کا نتیجہ تھا ، جس کی نسبت لارڈ لارنس مرحوم نے آخر کار فیصلہ کر دیا کہ محض کارتوس کی بدولت ایک سپاہیوں کا ہنگامہ تھا ۔ اور سر ولیم کے انڈر سکرٹری وزیر ہند کے نہایت انصاف سے (جیسا کہ سرسید بیان کرتے تھے) اُس کو ’سپاہی وار‘ سے تعبیر کرتے تھے ، نہ ملکی بغاوت سے ۔ مگر باوجود اس کے بھی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے دل صاف نہ ہوئے اور وہ اُن کو بدستور انگلش گورنمنٹ کا بدخواہ اور انتظام کا دشمن خیال کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۱ع میں ، یعنی غدر کے زمانے سے پندرہ برس بعد ، ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب ”اور انڈین مسلمانز“ میں صاف لکھا تھا کہ ”ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں ، جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں ۔“

صاحبو ! میں اس موقع پر سرسید کی ان کوششوں کی تفصیل بیان کرنی نہیں چاہتا جو انھوں نے مسلمانوں پر سے اس داغ کے چھڑانے میں کی ہیں ، کیوں کہ وہ ۱۸۵۷ع سے لے کر آخری وقت تک ، جو اکتالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے ، برابر اسی دھن میں لگے رہے ہیں کہ قوم کی پولٹیکل حالت درست ہو ، گورنمنٹ میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو ، انگریزوں میں اور اُن میں ربط و اتحاد کو ترقی ہو اور وہ اپنی ہم وطن قوموں سے عزت میں ، مرتبے میں اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہونے میں کسی طرح پیچھے نہ رہیں ۔ اس غرض سے جو جو کام اور جو جو کوششیں اُنھوں نے اس اکتالیس برس کے عرصے میں کی ہیں ، اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے ، یہاں تک کہ میرے نزدیک ایک شخص کا ہرگز کام نہیں کہ اُن کی قومی خدمات کو بالاستیعاب اُن کی لائف میں بیان کر سکے ۔ مگر جہاں تک کہ امکان میں تھا ان خدمات کا مفصل ذکر اُن کی لائف میں کیا گیا ہے ،

جو عنقریب پبلک کی نظر سے گزرنے والی ہے ۔ پس میں اس ذکر کو چھوڑ کر صرف اُن نتائج کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو اُس مرحوم کی کوششوں سے ملک اور قوم کے حق میں مترتب ہوئے ۔

صاحبو ! جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا ۔ مسلمانوں کا سیدھے رستے پر ڈالنا ایسا ہی مشکل تھا جیسا دریا کا بہاؤ کی سمت سے دوسری طرف رخ پھیر دینا ۔ اور انگریزوں کو اس بے اعتباری اور بدگمانی کے بعد ، جس کا غدر کے واقعات نے اُن کے دل میں نقش بٹھا دیا تھا ، مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا ۔ ایک طرف سے سرسید کو یہ آواز آتی تھی کہ ''جبل گردد جبلی نہ گردد'' اور دوسری طرف سے ان کو یہ جواب ملتا تھا کہ ''آزمودہ را آزمودن جہل است ۔'' مگر اُس کوہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری ، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا ۔ اس نے ایک جماعتِ کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے ۔ اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے ۔ اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو اُن کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا ۔ وہ اپنی سلامتی بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں ۔ ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہوگئے ہیں ۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں ۔ اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے ۔ ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں

گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں ۔

سر سید نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنی پُرزور تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے خیالات کی اصلاح کر دی ہو ، بلکہ وہ اپنی قوم میں وفاداری ، اخلاص اور اطاعت کا ہمیشہ کے لیے بیج بو گیا ہے ۔ وہ اُن کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک ایسا بار آور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری اور فرمان برداری ہے :

کوہ ہا کندست تا ایں جوے شیر آوردہ است
ہو کہ آبِ رفتہ در جوے شما آید ز سر

جس طرح اُس نے قوم کے خیالات کی اصلاح کی اور اُن میں ہمیشہ کے لیے وفاداری اور اخلاص کی بنیاد ڈالی ، اسی طرح اُس نے حکمران قوم کی نظر میں جہاں تک کہ ممکن تھا اُن کا اعتبار بڑھانے میں کوشش کی اور وہ تمام شکوک و شبہات ، جو انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئے تھے اور جو بظاہر کسی طرح مٹنے والے نہ تھے ، ان کو مٹایا ۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو کچھ اپنی کتاب 'آور انڈین مسلمانز' میں مسلمانوں کے برخلاف لکھا تھا ، بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں نے اس کی تردید کی ۔ 'پایونیر' میں ایک بڑے لائق عربی داں انگریز کا بہت مبسوط آرٹیکل ، جس کی نسبت یقین کیا گیا تھا کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کا لکھا ہوا تھا ، انھیں دنوں میں شائع ہوا ۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ وہابیوں کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریبِ سلطنت کی فکر میں رہتے ہیں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتے ہیں اور غدر و بغاوت کی تحریک کرتے ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا تھا) محض تہمت ہے'' ۔ سر ایلفرڈ لائل نے اپنے ایک 'اسّے' میں جو 'تھیالوجیکل ریویو' میں چھپا ، لکھا کہ اس مصنف کو مبالغے کا

جنّ بسا اوقات نہایت پریشان کر دیتا ہے ، اور بہتر ہوتا اگر وہ اس جنّ کو اتار دیتا ۔'' 'انڈین آبزرور' کے ایڈیٹر نے ، جو خود انگلش مین تھا اور اس کا اخبار تمام اینگلو انڈین افسروں کی رائے کا آئینہ تھا ، جب سر سید کا ریویو کتاب مذکور کے برخلاف شائع ہوا ، تو ایک نہایت زبردست آرٹیکل سرسید کی تائید میں لکھا ، جس میں درحقیقت ڈاکٹر ممدوح کی کتاب کی دھجیاں آڑائی تھیں ، اور جس کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے ، جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت ، بلکہ ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ آس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت تصفیہ کر دیا ہے ۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے ، اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں ، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو ۔

سرسید کے ریویو کا اثر جو کچھ کہ گورنمنٹ پر ہوا آس کا اندازہ ، جیسا کہ معتبر ذریعے سے سنا گیا ہے ، اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس ریویو کے شائع ہونے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں ہوا ، حالانکہ کئی برس سے آن کی گرفتاری برابر جاری تھی ۔ خود ڈاکٹر ممدوح کے خیالات ، جہاں تک کہ قیاس ہو سکتا ہے ، سرسید کا ریویو دیکھنے کے بعد بدل گئے تھے اور ان کو مسلمانوں کے ساتھ یقیناً بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی ، جیسا کہ ان کے اس برتاؤ سے ، جو اس واقعے کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا ، ثابت ہوتا ہے ۔ انہوں نے مدرسۃالعلوم کی پختہ بارک میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا ۔ اور ۱۸۸۲ع میں ، جب کہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریذیڈنٹ تھے ،

کمیشن کے دورے کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علی گڑھ میں کیا ، اور اپنی آخری اسپیچ محمدن کالج میں آ کر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور آن کی کوششوں کی بےانتہا تعریف کی اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی ۔

سرسید کی کوشش سے جو اعتبار حکم ران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے ، آس کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے مشہور اخبار ''پال مال گزٹ'' مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ع میں سرسید کی وفات پر یہ فقرہ لکھا تھا کہ ''سرکارِ انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کتاب میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر دے سکتے ہیں ۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو آس نے خدمتیں کیں آن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا ۔''

اسی طرح سر آکلنڈ کالون نے جیسا کہ مسٹر تھیو ڈور بیک نے سرسید کے ماتمی جلسے میں بیان کیا تھا ، لفٹنٹ گورنری کے زمانے میں اس مرحوم کی نسبت یہ فرمایا تھا کہ ''کسی زندہ شخص نے ، عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی ، برٹش گورنمنٹ کے استحکامِ سلطنتِ ہندوستان کے بارے میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے ۔''

ظاہر ہے کہ سرسید نے نہ کسی ملکی معاملے میں کوئی سفارت کی خدمت انجام دی تھی ، نہ کوئی ملک فتح کیا تھا ، نہ کوئی کالونی آباد کی تھی ، نہ کسی صوبے کا بند و بست کیا تھا ؛ پھر وہ کون سی خدمت اور کون سی کوشش سرسید نے کی تھی جس کا ذکر انگلستان کے اس نام ور اخبار نے اور ہندوستان کے اس جلیل القدر مدبر نے

کیا ہے ؟ وہ یہی خدمت اور یہی کوشش تھی کہ جس قوم سے انگریزوں نے سلطنت لی تھی ، جس کو وہ اپنا حریف جانتے تھے ، جو مذہبی تعصبات میں شہرۂ روزگار تھی اور گورنمنٹ کے حق میں سخت خطرے کی چیز سمجھی جاتی تھی ، اُس میں صرف اسی شخص نے اپنے زبردست ہاتھوں سے لائلٹی اور وفاداری کا بیج بویا ہے اور حکم ران قوم کو کم سے کم اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ ہماری حکومت کو مسلمانوں کی طرف سے کچھ خطرہ نہیں ہے ۔ کرنل گریہم سرسید کی لائف میں لکھتے ہیں :

> ”غدر کے زمانے میں اور بہت مدت بعد تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی ہوئی تھی ۔ اس خوف ناک زمانے کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب کیے جاتے تھے ، اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعصب زیادہ تر بے جا تھا ۔ مسلمانوں کو اس بات کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی ۔ ظاہرا کسی شخص نے ان کی حمایت کی حامی نہیں بھری ۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمے لیا اور جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا ، انھوں نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر درست کیا ۔“

ایک اور نہایت لائق اور شریف انگریز نے سرسید کی وفات کے بعد ، جو ان کی پولٹیکل خدمات پر ایک آرٹیکل لکھا تھا ، اس میں بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ”غدر سے پہلے اور اس کے چند سال بعد تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر ان کو ترقی دینے اور ان کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضا مند نہیں ہوتے تھے ۔ نہایت نمایاں انقلاب جو حال میں اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے ، یہ صرف سرسید کی تلقین کا نتیجہ ہے ۔ اُس نے مسلمانوں کے دل میں ، جہاں پہلے نفرت اوو بدگمانی ہوتی تھی ، وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں ۔“

صاحبو ! یہ بہت بڑا احسان سرسید کا اپنی قوم پر تھا ۔ عربی میں یہ مثل مشہور ہے : ”ثبت العرش ثم نقش“ (یعنی پہلے چھت قائم کر لو ، پھر نقش و نگار قائم کرنا) ۔ اسی طرح ایک قوم کے خیر خواہ کا سب سے مقدم کام یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی پولٹیکل حالت درست کرے ، قوم کو گورنمنٹ کا خیرخواہ بنائے اور گورنمنٹ کو اس پر مہربان کرے ۔ اگرچہ بہ ظاہر سرسید کی اس کوشش میں بہ نسبت قوم کی خدمت کے گورنمنٹ کی خدمت کا پہلو غالب ہوتا ہے ، لیکن اگر ذرا غوز کر کے دیکھا جائے تو یہ سراسر قوم کی خدمت اور خیر خواہی کا کام تھا ۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی مثال چھری اور خربوزے کی تھی ۔ پس مسلمانوں کے تعلقات اگر برٹش گورنمنٹ کے ساتھ خدا نخواستہ ویسے ہی رہتے جیسے کہ غدر کے بعد ہو گئے تھے ، تو گورنمنٹ کو اس سے زیادہ تکلیف نہ ہوتی جتنی کہ چھری کو خربوزہ کاٹنے میں ہوتی ہے ، مگر خربوزے کا کام تمام ہو جاتا ۔

بے شک یہ کام سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مشکل تھا ، مگر اے صاحبو ! یہ نہ سمجھنا کہ سرسید نے مسلمانوں کو صرف یہی فائدہ پہنچایا ہے ، یا مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی اور قوموں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا ۔ اُس کے احسانات جو ملک اور قوم پر ہیں ، وہ احصا اور شمار کے اندازے سے باہر ہیں ۔ اُسی نے سب

سے پہلے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کو سمجھایا کہ جب تک دیسی لوگ لیجسلیٹو کونسل میں ممبر نہ ہوں گے، اس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں، جن کا نتیجہ ۱۸۵۷ع کا غدر تھا، رفع نہ ہوں گی۔ چناں چہ گورنمنٹ نے ان کی صلاح کے موافق عمل کیا۔ رسالۂ 'اسبابِ بغاوت' جس میں یہ صلاح دی گئی تھی، ۱۸۶۰ع میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ع میں تین ہندوستانی رئیس پہلی بار کونسل کی ممبری پر نام زد کیے گئے۔

اسی نے رسالۂ مذکور میں سب سے پہلے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمے داری کے عہدے نہیں دیے جاتے۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد، یعنی ۱۸۶۲ع میں پہلی ہی بار پنڈت شمبو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے، جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

اسی نے شمالی ہندوستان میں سوسائٹیاں اور انجمنیں اور سبھائیں قائم کرنی لوگوں کو بتلائیں۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ سے پہلے، جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، کوئی قومی مجلس یا سوسائٹی، اودھ، اضلاع شمال مغرب اور پنجاب میں ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں یا ہندوؤں نے ملک یا قوم کی بھلائی کے لیے قائم کی ہو۔ خصوصاً مسلمانوں میں ایک مجلس کے سوا، جو کلکتے میں 'مجلس مذاکرۂ علمیہ' کے نام سے قائم تھی، اس وقت تک کوئی مجلس ہندوستان کے کسی صوبے میں قائم نہیں ہوئی تھی۔

اسی نے دیسی اخباروں کو، جن میں جھوٹی سچی خبروں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا، پولٹیکل، سوشل اور علمی و اخلاق مضامین کا مخزن بنایا اور بجائے اس کے کہ وہ محض لوگوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے، ان کو اس قابل بنا دیا کہ گورنمنٹ ان کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اسی نے اردو لٹریچر اور اردو زبان کو ایک قطرے سے دریا بنا دیا۔ قطع نظر اس بےبہا امداد کے جو خود سرسید کے لٹریری ورکس سے اردو لٹریچر کو پہنچی اور قطع نظر ان گراں قدر کوششوں کے جو انھوں نے اردو زبان کی حمایت میں اخیر دم تک برابر جاری رکھیں، اگر سچ پوچھو تو ۱۸۶۸ع سے اب تک جو اردو زبان نے غیر معمولی ترقی کی ہے وہ اسی مرحوم کی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔ سوسائٹی کی طرف سے جو ایڈریس انھوں نے سنہ مذکور میں، بہ حضور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب، علی گڑھ میں پیش کیا تھا، اس ایڈریس کے جواب میں سوسائٹی کی درخواست کے موافق ہز آنر نے وعدہ کیا تھا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی، ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چناں چہ ۲۶ اگست ۱۸۶۸ع کو، یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد، سر ولیم میور کی گورنمنٹ نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصے میں تمام ملک کو دیسی زبان کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ گورنمنٹ کے انعام سے جو محض ترغیب کے لیے مقرر کیا گیا تھا، کچھ زیادہ لوگ مستفید نہیں ہوئے، اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی، لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام جماعت میں، جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی لیاقت رکھتی تھی، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدۂ عظیم پہنچایا اور خود بھی حقِ تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ اور اس طرح خاص کر اردو لٹریچر چند برسوں میں اس قدر ترقی کر گیا جس کی صدیوں تک امید نہ تھی۔

اسی کی چیخ پکار اور اسی کی ریس سے اطرافِ ہندوستان میں متعدد پرائیویٹ کالج قائم ہوگئے ۔ اسی نے سب سے پہلے ہندوستانیوں کو سلف ہیلپ کا سبق پڑھایا ۔ اسی نے ان کو اپنے قومی کاموں میں بغیر کسی دباؤ کے چندہ دینا سکھایا ۔ اسی نے اولاد کی تعلیم میں لوگوں کو بے دریغ روپیہ خرچ کرنا بتایا ۔ اسی نے ان کو یہ گُر سوجھایا کہ نالائق اور بے تربیت اولاد کے لیے جائداد خرید کر چھوڑ جانا ان کو دین و دنیا سے کھو دینا ہے ۔ اور بڑا سلوک اولاد کے ساتھ یہی ہے کہ جو کچھ ہو سکے اُن کی تعلیم و تربیت میں خرچ کیا جائے ۔ اسی نے خاص کر شمالی ہندوستان میں اولاد کو تعلیم کے لیے بھیجنے کی راہ نکالی اور ایک بہت بڑا گروہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کا ملک میں پیدا کر دیا ۔

صاحبو ! یہ شاعرانہ مبالغے نہیں ہیں بلکہ بالکل صحیح واقعات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔ اور اگر کسی کو شبہ ہو تو اس کو چاہیے کہ ’علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ‘ اور ’تہذیب الاخلاق‘ کی جلدیں اول سے لے کر آخر تک دیکھے ، تاکہ اس کو معلوم ہو کہ سرسید نے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی کام ، جو اب تک ہوا ہے ، ایسا نہیں ہے جس میں اس مرحوم نے حصہ نہ لیا ہو ۔ سب سے بڑی ملک اور قوم کی ہمدرد جماعت آج کل انڈین نیشنل کانگرس سمجھی جاتی ہے ۔ اگرچہ سرسید اس کے طرز عمل کو ناپسند کرتے تھے اور اس ایجیٹیشن کو بہت برا جانتے تھے جو اس کے بانیوں نے اول اول ہندوستان میں پھیلایا تھا ، مگر جس اصول پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ وہی اصول تھا جو سرسید نے اسبابِ بغاوت کے بیان کرنے میں سب سے پہلے اختیار کیا تھا ، اور پھر برٹش انڈین ایسوسی ایشن اسی اصول پر علی گڑھ میں قائم کی تھی ۔ میرے ایک عزیز دوست جو ولایت سے ابھی تعلیم پا کر آئے ہیں ، اُن کا بیان ہے کہ مسٹر ہیوم بانی نیشنل کانگرس نے ولایت میں اُن سے ذکر کیا کہ مجھ کو جو ہندوستان میں کانگرس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ صرف سرسید احمد خاں کی کتاب ’اسباب بغاوت‘ کے دیکھنے سے پیدا ہوا تھا ۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اب سرسید کی رائے کیوں کر اپنی قدیم رائے کے برخلاف ہوگئی ۔

ہم اس موقع پر اس سوال کے متعلق زیادہ بحث کرنی نہیں چاہتے ۔ مگر ولایت کے مشہور اخبار ’سینٹ جیمس بجٹ‘ میں جو رسالۂ ’اسباب بغاوت‘ پر ریمارک کیا گیا تھا ، اس میں سے ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں جس سے حاضرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسید کے طریقے میں ، جو انھوں نے رسالۂ ’اسباب بغاوت‘ میں اختیار کیا تھا ، اور نیشنل کانگرس کے طرز عمل میں کیا فرق تھا ؟ وہ لکھتا ہے کہ :

> ”ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے ، بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں ۔“

نیز ’ہوم نیوز‘ نے اسی کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ :

> ”سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے ، اُن میں بعضی نہایت قیمتی اور عمل در آمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکامِ ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں ۔ اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس معاملے پر ظاہر کی ۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا ۔ وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے ، اور

جن کی صحت تجربے سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے ۔‘‘

مذکورہ بالا ریمارکس سے ظاہر ہے کہ جو اثر صرف ایک شخص کی تحریر نے ایسے غیظ و غضب کے زمانے میں ، جیسا کہ غدر کے بعد کا زمانہ تھا ، گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے خیالات پر اس قدر جلد کیا تھا ، ویسا اثر نیشنل کانگرس نے ، جو ہندوستان کے لائق ترین اشخاص کا مجمع ہے ، اپنی پندرہ برس کی چیخ و پکار اور شور و غل سے نہیں کیا ۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے ؛ سرسید نے اپنی شکایتوں سے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے سوا ، کیا ہندوستانی اور کیا انگریز ، کسی متنفس کو مطلع نہیں کیا ۔ اور کانگرس کے ممبران نے پچاس ہزار رسالے ، جن میں گورنمنٹ کی سر تا پا شکایتیں درج تھیں ، ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر ملک میں عام طور پر تقسیم کیے ، جن کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ ’’کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں میں اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جواب دہ ہوئے ، جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے ، اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا ۔‘‘

بہرحال اگر بالفرض نیشنل کانگرس کے مقاصد اور اُس کی خواہشوں کو سراسر واجبی اور ملک کے حق میں مفید تسلیم کر لیا جائے ، تو بھی اُس نے اب تک سرسید کے ایک نفس واحد سے کوئی زیادہ بات اس کے سوا نہیں کی کہ جس گرہ کو سرسید نے ہاتھوں سے کھولا تھا ، اُس کو کانگرس نے دانتوں سے کھولنے کا ارادہ کیا اور اسی لیے اس کو بہت ہی کم کامیابی ہوئی ۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو سرسید نے ۱۸۶۶ع میں بمقام علی گڑھ آ کر قائم کی تھی ، اُس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار

کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں ۔ مگر چوں کہ ملک میں اُس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی ، اس لیے سرسید نے آخرکار اس کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہندوستانیوں میں اعلیٰ درجے کی تعلیم نہ پھیلے گی ، اُس وقت تک یہ تمام سوسائٹیاں اور انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں بے سود ثابت ہوں گی ۔ چناں چہ ولایت سے واپس آ کر اُنھوں نے تعلیم کی بنیاد ڈالی ، اور اُس کی ترقی میں فوق العادۃ کوششیں کیں ، جن سے آپ سب صاحبان بخوبی واقف ہیں اور جو اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا عظیم الشان کام ہے ، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے ۔ مگر ایک دل چسپ فقرہ جو ’ٹائمز آف لندن‘ میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی تعلیمی کوششوں کے متعلق چھپا تھا ، اُس کا اس موقع پر نقل کرنا غیرمناسب نہ ہوگا ۔ اُس میں سرسید کے بڑے بڑے کاموں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ’’اس شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملے کا خیال دلوانے میں بہت محنت اور جاں فشانی فرمائی ، اور فی الحقیقت جب اس معاملے میں ان کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے ۔‘‘

صاحبو ! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ، یہ اُس مرحوم کی ملکی اور قومی خدمات کا ایک نہایت مختصر بیان تھا ، جو محض بطور نمونے کے حاضرین کی خدمت میں عرض کیا گیا ۔ مگر اب تک میں نے اُن کی مذہبی خدمات کے متعلق کچھ نہیں کہا ۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی میرے دل میں کچھ عظمت

نہیں ہے ۔ میرے نزدیک اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کام 'خطبات احمدیہ' اور 'تفسیر القرآن' کا لکھنا ہے ۔ مگر اے صاحبو ! ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی ، جیسی کہ چاہیے ، مسلمانوں میں قدر ہو ۔ مذہبی خیالات کا یقین جس طرح کسی دلیل سے انسان کے دل میں نہیں بیٹھتا بلکہ محض اگلوں کی تقلید سے بیٹھتا ہے ، اسی طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہو سکتا ۔ پس سرسید کی مذہبی تصنیفات کی ضرورت اور اُن کی وقعت کیسی ہی پختہ اور مضبوط دلیلوں سے ثابت کی جائے ، موجودہ حالت میں ہرگز امید نہیں کہ لوگ اس کو تسلیم کریں ۔ مگر میرے نزدیک وہ زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے جب کہ سرسید کی مذہبی خدمات کی پوری پوری قدر کی جائے ، اور گو اُن کی بعض رائیں اور خیالات قابل اعتراض سمجھے جائیں مگر بہت بڑا حصہ اُن کی تحقیقات کا آبِ زر سے لکھنے کے قابل سمجھا جائے گا ۔ سرسید نے خود ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا تھا کہ ''اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر ، اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کرکے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آئے اُس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے ۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں ، تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں ۔ سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں ۔''

چوں کہ اُس مرحوم کا اپنی تفسیر کی نسبت یہ خیال تھا ، اس لیے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے اس عام مجمع میں میں ان کی مذہبی خدمات کا ذکر کروں ۔ اور اُن کے احسانات کے ضمن میں ایک ایسی دوا کا بیان کر دوں جس کی کڑواہٹ سردست

محسوس ہوتی ہے اور اُس کے فوائد ابھی تک نا معلوم ہیں ۔ البتہ سرسید کی سرکاری خدمات جن کی بدولت انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدے پہنچائے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک عمدہ ترین نمونہ حسنِ خدمت کا ہیں ، بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان کو اُن کا احسان مند اور شکر گزار ہونا چاہیے ۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی سرکاری خدمات بھی اس وقت تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی جا سکتیں ، اس لیے میں صرف 'پال مال گزٹ' اور سرآکلنڈ کالون کے مذکورۂ بالا فقروں کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ''جو خدمتیں اُس نے کیں ، اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا ۔'' اور ''کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی ، برٹش گورنمنٹ کے استحکامِ سلطنتِ ہندوستان کے بارے میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جیسی کہ سرسید نے کی ہے ۔''

ایام غدر کی خدمات کے متعلق صرف جان اسٹریچی کے یہ مختصر الفاظ لکھنے کافی ہیں کہ ''کسی شخص نے اُس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا ، جیسا کہ ۱۸۵۷ع میں سید احمد خاں نے دیا ۔ میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے اُس کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے ۔''

اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسے شخص کی یادگار قائم کرنی ، جس کے احسانات میں ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے ، ہم سب مسلمانوں کا قومی فرض ہے ۔ بلکہ سچ پوچھو تو خود اپنے اوپر احسان کرنا ہے کہ جو یونیورسٹی اُن کی یادگار میں قائم ہونی تجویز ہوئی ہے ، وہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک سرچشمہ ہوگی اور ہماری قوم کی سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر سرسبز و شاداب کرے گی اور ہماری اولاد کو ہمیشہ اُس شخص کے

احسانات یاد دلائے گی جو اُن عنقا صفت لوگوں میں سے تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے:

بنی نوع کے ہر مصیبت میں یاور
ہوا خواہِ ملت، بد اندیشِ کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود اُن سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود اُن سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی، صعوبت ہے اُن پر
کسی پر ہو غم، رنج و کلفت ہے اُن پر
کہیں ہو فلاکت، مصیبت ہے اُن پر
کہیں آئے آفت، قیامت ہے اُن پر

کسی پر چلیں تیر، آماج یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر، تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے
یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے
یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے

اُمنڈتا ہے رکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جاتے ہیں جب پاؤں، ہٹتے نہیں یہ
بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب، پھر سمٹتے نہیں یہ
جہاں بڑھ گئے، بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

مہم بِن کیے سر، نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں، اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت
سمائی ہے دل میں بہت اُس کی عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منہ کوئی زحمت
نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو
ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار اُن کو
برابر ہے میدان و کہسار اُن کو

نہیں حائل اُن کے کوئی رہ گزر میں
سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے
زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے
کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے

انہیں پر ہے، کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے، گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت
انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت
انہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انہیں کا اُجالا ہے ہر رہگزر میں
انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں
انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں
انہیں سے یہ رتبہ تھا آدمؑ نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں نے جھکایا

۷

تقریر متعلق اصلاح و ترقی مسلمانان پانی پت

(قلمی مسودے سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے باشندگانِ قصبۂ پانی پت کے ایک جلسے میں اپنے اہل وطن کی معاشرتی اصلاح اور انسدادِ رسومِ قبیحہ کے متعلق فرمائی تھی۔ یہ تقریر کہیں شائع نہیں ہوئی۔ مجھے اُن کے قلمی مسودوں میں سے ملی تھی جو ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ (محمد اسماعیل)

جناب چیئرمین اور تمام حاضرین جلسہ !

پہلے اس سے کہ اصل مطلب کے متعلق کچھ بیان کیا جائے، اول حضور ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند کی مادرانہ شفقت اور مہربانی کا جنھوں نے ہندوستان کی بہبودی کے لیے منصف اور خدا ترس حاکم مقرر کیے ہیں، اور پھر اپنے صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر ڈینس فٹز پیٹرک کی عنایت کا جو ہماری بہبودی کا خیال ہم سے بہت زیادہ رکھتے ہیں، اور خاص کر اپنے ضلع کے نیک دل اور ہر دل عزیز ڈپٹی کمشنر مسٹر آگنیو کا جو صرف ہمارے فائدے کے لیے کرنال سے یہاں تشریف لائے ہیں، شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

جس کام کے لیے ہم سب لوگ آج اس مقام پر جمع ہوئے ہیں،

وہ ایسا ضروری کام ہے کہ ہم کو بغیر اس کے کہ اپنے حاکموں کو اس کے لیے تکلیف دیتے ، خود اس کے لیے سرانجام کرنے کی فکر کرنی چاہیے تھی ۔ اگرچہ جس قدر قومیں اس قصبے میں آباد ہیں ، ہم کو اُن سب کے ساتھ ہمدردی ہے اور ہماری آرزو ہے کہ سب مل جل کر اپنی حالت درست کریں ، مگر میں اس موقع پر خاص کر چاروں طرفوں کے مسلمان بسوہ داروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری مراد انصاری ، مخدوم زادے ، راجپوت اور پٹھان ہیں اور جن کا حال روز بروز نہایت سقیم ہوتا جاتا ہے ۔

چاروں قوموں میں چند مستثنیٰ آدمیوں کے سوا ، جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ، کوئی شخص آسودہ اور خوش‌حال نظر نہیں آتا ۔ اُن کی حقیّت نصف سے زیادہ بیع اور رہن کے ذریعے سے غیر بسوہ داروں کے پاس منتقل ہو چکی ہے اور جو باقی ہے وہ برابر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے ۔ ناداری اور افلاس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سیکڑوں آدمی اپنی اولاد کو صرف اس وجہ سے تعلیم نہیں دلوا سکتے کہ مدرسے کی فیس اور کتابوں کی قیمت ادا کرنے کا فی‌الواقعہ مقدور نہیں رکھتے ۔ چاروں قوموں میں آدمیوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جاتی ہے ۔ نسلیں برابر منقطع ہوتی جاتی ہیں ۔ پچھلے چالیس پینتالیس برس کے عرصے میں اکثر خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے ۔ بہت سے خاندان چراغ سحری ہیں ، نااتفاقی اور پھوٹ اور قصے جھگڑے ، جو ادبار کی نشانیاں ہیں ، کم و بیش چاروں قوموں میں پھیل رہے ہیں ۔ اگر ان تمام خرابیوں کا سبب پوچھا جائے تو ہمارے بھائیوں کے پاس صرف ایک جواب ہے ؛ وہ کبھی اپنا قصور نہیں بتاتے بلکہ ہمیشہ خدا کو الزام دیتے اور کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی یہی ہے ، حالانکہ خدا نے ، جیسا کہ خود قرآن میں فرماتا ہے ، کسی قوم کو جب تک وہ آپ نہیں بگڑی ، کبھی نہیں

بگاڑا ۔ درحقیقت یہ ہماری نالائقی ہے کہ جو خرابیاں خود ہمارے سبب سے ہم پر آ رہی ہیں اُن کو ہم خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنے تئیں بے قصور قرار دیتے ہیں ۔ چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور سوچیں کہ ہماری یہ حالت خود بخود ایسی ہوتی چلی جاتی ہے یا ہم اپنے کرتوتوں سے اپنے تئیں آپ برباد کر رہے ہیں ۔

ہمارے بزرگوں نے جو رسمیں آسودگی کے زمانے میں مقرر کی تھیں ، ہم اُن رسموں کو بے‌مقدوری اور ناداری کے زمانے میں جاری رکھنا چاہتے ہیں ۔ مونڈن ، ختنہ ، بسم اللہ ، منگنی اور بیاہ وغیرہ میں اپنے بساط سے زیادہ خرچ کرتے ہیں ۔ جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نقدی یا زیور ہوتا ہے ، وہ انجام کا خیال بالکل نہیں کرتے اور محض فضول اور بے جا تقریبوں میں سب خرچ کر کے بیٹھ رہتے ہیں ۔ جن کے پاس زیور یا نقدی نہیں ہوتی وہ گھر بار بیچ کر یا رہن رکھ کر بڑوں کی ریت پوری کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ تجارت ہم نہیں کرتے ، دکان داری اور صنعت و حرفت کو عیب سمجھتے ہیں ، نوکری کرنے کی لیاقت پیدا نہیں کرتے ۔ صرف زمین کی آمدنی پر ہم لوگوں کا گزارا ہے اور اسی پر ہماری عزت و آبرو کا انحصار ہے ۔ ایسی عزیز چیز کو ذرا ذرا سی فضول اور بیہودہ تقریبوں میں بیع یا رہن کر کے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتے ہیں ۔ وہی لوگ جن کو مدرسے کی فیس دینی سخت دشوار ہے اور اس لیے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے ، وہی شادی اور غمی کی بیہودہ رسموں میں گھربار بیچ کر پان پان سو ، ہزار ہزار روپیہ خرچ کر دیتے ہیں ۔ اولاد کی تعلیم جس سے زیادہ کوئی ضروری کام نہیں ہو سکتا ، اس کو تو اس بہانے سے ٹال دیتے ہیں کہ تعلیم کا خرچ ہم سے نہیں اٹھ سکتا اور اُن بیہودہ رسموں میں جن کو نہ

عقل جائز رکھتی ہے اور نہ شرع ، اپنی روزی کا آسرا فروخت یا رہن کر کے ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں ۔ رسموں کی پابندی نے یہاں تک مجبور کر رکھا ہے کہ صرف شادیوں ہی میں یہ فضولیاں نہیں ہوتیں بلکہ میت میں بھی اسی طرح آنکھیں بند کر کے خرچ کیا جاتا ہے ۔ باپ مر گیا ہے ، بیوی اور چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے ، اُس کی جائداد اور آمدنی بجائے اس کے کہ اُن صغیر سن بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں خرچ ہو یا اُس کے کنبے کے رزق کا سہارا ہو ، برس روز تک برابر برادری کی مہمان‌داری میں صرف ہوتی ہے ۔ سویم اور دسویں ، بیسویں ، چالیسویں ، چھ ماہی اور برسی میں سیکڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے ۔ بہت سے بھائی عدالت کے جھگڑوں میں اپنا بنا بنایا گھر بگاڑ دیتے ہیں ۔ دس دس بیس بیس کی حقّیت کے واسطے سینکڑوں ، ہزاروں روپیہ برباد کر دیتے ہیں ۔ برادری کی پنچایت کے فیصلوں سے ، جن میں ایک کوڑی خرچ نہیں ہوتی اور دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے ، کبھی راضی نہیں ہوتے ، اور عدالت میں سینکڑوں ، ہزاروں خرچ کرکے ہار اور جیت دونوں صورتوں میں تباہ ہو جاتے ہیں ۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اسباب ہیں جن سے ہماری حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے ۔ افلاس بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساری خوبیاں گھٹتی جاتی ہیں ۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو ان سب باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان تمام رسموں کو لغو اور اپنی تباہی و بربادی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ رسمیں موقوف ہو جائیں ، مگر وہ خود ایک رسم بھی موقوف نہیں کر سکتے ۔ ان کو شریعت کی باندھی ہوئی حدیں توڑنی آسان ہیں مگر رسم و رواج کی کوئی قید ان سے نہیں ٹوٹ سکتی ۔

بہ ظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ لوگ جن رسموں کو اپنے حق میں مضر جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ کسی طرح موقوف ہوجائیں ، ان کو خود موقوف نہیں کر سکتے ۔ مگر در حقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ برٹش گورنمنٹ کی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ہزاروں برس سے ڈسپاٹک گورنمنٹ یعنی شخصی حکومت چلی آتی تھی جس میں رعیت کی بھلائی اور بہبودی کا ہر ایک کام بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا ۔ رعیت جس طرح ملکی معاملات میں کچھ دخل نہ رکھتی تھی ، اسی طرح قومی رفاہ اور فلاح کے کاموں سے بھی اس کو کچھ سروکار نہ ہوتا تھا ۔ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں دیکھی گئی کہ کسی قوم نے بغیرمداخلتِ سلطنت کے صرف اتفاقِ باہمی سے کوئی مدرسہ قائم کیا ہو ، یا کوئی شفاخانہ جاری کیا ہو ، یا کوئی سوشل رفارم یعنی طریقِ معاشرت کی اصلاح کی ہو ، یا کوئی اور کام تمام قوم کی بھلائی کا کیا ہو ۔ البتہ خاص خاص اشخاص بڑے بڑے مفید کام کرتے تھے ۔ کسی وزیر نے تمام قوم کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کر دیا ، کسی امیر نے کوئی شفاخانہ جاری کر دیا ، کسی سردار نے پل بندھوا دیا ، کنواں کھدوا دیا ، سرائے بنوادی ۔ اور اسی طرح کے اور مفید کام خاص خاص شخص کرتے رہتے تھے ، لیکن تمام قوم نے متفق ہو کر کبھی کوئی رفاہ عام کا کام نہیں کیا ۔ قوموں کی ہر قسم کی بھلائی یا برائی ہمیشہ سلطنت کے قبضے میں رہی اور وہ ہمیشہ اپنے تئیں سلطنت کے ہاتھ میں ایسا سمجھتے رہے جیسا مردہ غسّال کے قبضے میں ہوتا ہے ۔ رفتہ رفتہ تمام رعایا بے حس و حرکت ہوگئی اور ایکٹوٹی یعنی عملی طاقت اُن میں بالکل مفقود ہوگئی اور یہ خصلت اُن کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی ۔

اگرچہ ہم برٹش گورنمنٹ کے نہایت شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہم کو برخلافِ شاہانِ سلف کے ہر طرح کی آزادی دی ہے ، ہم اپنی ترقی اور اصلاح کی ہر طرح کی تدبیریں عمل میں لا سکتے ہیں ، جس طرح

ہم اپنی تعلیم و تربیت کا سامان بغیر مداخلت گورنمنٹ کے کر سکتے ہیں اسی طرح ہر قسم کی سوشل اصلاحیں بغیر گورنمنٹ کی دست اندازی کے کر سکتے ہیں ، مگر ایشیائی خود مختاری جو ہزارہا سال سے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ابتدائے آفرینش سے ایک حالت پر چلی آتی تھی اور جس نے ایشیا کی تمام قوموں کو بے حس و حرکت کر دیا تھا ، اس کا اثر ابھی تک ہماری رگوں اور پٹھوں میں موجود ہے ۔ اس لیے ہم آزادی کی نعمت سے ، جو گورنمنٹ نے ہم کو بخشی ہے ، حالتِ موجودہ میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ ہم خاص اپنی بھلائی کا کوئی کام بغیر گورنمنٹ کی امداد کے نہیں کر سکتے ۔ گورنمنٹ نے ستی اور دختر کشی کی رسم خود موقوف کی ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہندوستان کا دامن شاید اب تک ان گناہوں سے پاک نہ ہوتا ۔ اسی طرح گورنمنٹ نے بیسیوں قانون ہماری صحت کے متعلق ، ہمارے رسم و رواج کے متعلق ، ہماری اخلاقی اور دماغی تربیت کے متعلق ایسے بنائے ہیں جن سے خاص ہمارے ذاتی فائدے کے سوا گورنمنٹ کی کوئی غرض متعلق نہیں ہے ۔ اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کی خوبی یہی ہے کہ اس کی رعیت ہر طرح آسودہ اور خوش حال ہو ۔

ہم گورنمنٹ کی اس خاص عنایت کا نہایت سچے دل سے اقرار کرتے ہیں اور اُس کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہماری شادی اور غمی کے اخراجات کے انتظام کی طرف توجہ فرمائی ہے ۔ اور ہمارے ضلع کے نیک دل اور غریب پرور ڈپٹی کمشنر اسی غرض کے لیے ہمارے قصبے میں تشریف لائے ہیں ۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قسم کی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں مگر ان سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا ۔ اور اگر میری رائے غلط نہ ہو تو ہرگز امید نہیں کہ اس تحریک سے بھی بغیر سرکاری دباؤ کے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہوگا ۔

۸

سرسید مرحوم پر ایک تقریر

(رسالہ 'زمانہ' کان پور ، فائل ۱۹۰۶ع)

۱۹۰۵ع کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا حالی کو نظام دکن میر محبوب علی خاں کے جشن چہل سالہ کی روئداد لکھنے کے لیے سرکاری طور پر حیدر آباد بلایا گیا تھا ۔ مولانا کا قیام حیدر آباد میں دسمبر ۱۹۰۵ع سے جون ۱۹۰۶ع تک رہا ۔ حیدر آباد میں ہر سال سرسید کی برسی بھی نہایت شان سے منائی جاتی تھی ، جس میں بڑے بڑے لوگ شامل ہو کر سرسید کی حیات ، اُن کی مختلف حیثیتوں اور اُن کے کارناموں پر تقریریں کیا کرتے تھے ۔ ۱۹۰۶ع میں یہ برسی وہاں ایسے موقعے پر منعقد ہوئی ، جب کہ مولانا حالی بھی اتفاق سے حیدر آباد ہی میں موجود تھے ۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر منتظمین نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ جلسے میں تشریف لائیں اور اپنے عظیم رفیق سرسید احمد خاں پر ایک تقریر فرمائیں ۔ مولانا نے خوشی کے ساتھ یہ پیش کش قبول کی ۔ جو تقریر آپ نے وہاں فرمائی ، وہ بعد میں منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر رسالہ 'زمانہ' کان پور کو اُن کی درخواست پر ۷- اپریل ۱۹۰۶ع کو

اشاعت کے لیے بھیج دی ، جو فوراً ہی رسالۂ مذکور میں شائع ہوگئی تھی ۔ (محمد اسماعیل)

معزز حضرات ! جس رسم کے ادا کرنے کے لیے آج سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں ، یہ اُس شخص کی برسی کی تقریب ہے جس نے پچاس برس متصل ملک اور قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی خدمت گزاری میں بسر کیے ، اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اس کو پیش آتی رہیں ، وہ اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا ۔ خود مسلمانوں نے جن کی خیر خواہی میں اس نے اپنی دوتہائی زندگی صرف کی ، اُس کو کافر ، ملحد ، نیچری ، دجّال سب کچھ کہا ۔ اس کے کفر پر سیکڑوں فتوے لکھائے گئے ۔ اُس پر اور اُس کے کاموں پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں ۔ اُس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں ۔ اس کے برخلاف ملک کے ہر گوشے سے نئے نئے اخبار اور رسالے برابر جاری ہوتے رہے ۔ مگر اُس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور جو منصوبہ مسلمانوں کی بھلائی اور خیر اندیشی کا ابتدا سے باندھا تھا اس کو دمِ واپسیں تک پورا کرتا رہا ۔ میری مراد اُس شخص سے سرسید احمد خاں مرحوم ہیں جن کی وفات کو آج پورے آٹھ برس گزرے ہیں ۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ جس شخص کو چند روز پہلے کافر و ملحد کہا جاتا تھا اب ملک کے اطراف و جوانب میں ہر سال اُس کی برسی کی جاتی ہے اور اُس کے احسانات ، جو اُس نے قوم پر کیے ہیں ، یاد کیے جاتے ہیں ۔ اور امید ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا ، اُس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی ۔ جس طرح ماں باپ کا غصہ اور خفگی اولاد کو بچپنے میں ناگوار گزرتی ہے مگر بڑے ہو کر اُس غصے اور خفگی کی قدر ہوتی ہے ، اسی طرح

جو لوگ تاریکی اور جہالت کے زمانے میں اپنی قوم کو اُن کی آئندہ بھلائی کا رستہ بتاتے ہیں ، گو اُس وقت اُن کی باتیں سب کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں ، مگر جوں جوں لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں ، اُن پر ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ جن باتوں کو ہم زہر سمجھتے تھے ، وہ درحقیقت ہمارے حق میں تریاق تھیں ۔

یورپ میں اُن لوگوں کی یادگاریں ، جنھوں نے اپنے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا یا چھوٹا کام اپنی زندگی میں انجام دیا ہے ، طرح طرح سے قائم کی جاتی ہیں : اُن کے نام کی عظیم الشان عمارتیں بنائی جاتی ہیں ، اُن کے مجسمے گزرگاہوں اور شاہ راہوں پر نصب کیے جاتے ہیں ، اُن کی سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں ، اُن کے کارنامے اولاد کو پڑھائے جاتے ہیں تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی ریس کرنے اور اُن کے قدم بہ قدم چلنے کا شوق پیدا ہو ۔

یورپ کا ایک مصری مسلمان سیاح ، جس نے اٹلی میں وہاں کے نام ور لوگوں کی یادگاریں اور اسٹیچو اپنے زمانۂ سیاحت میں دیکھے ہیں ، لکھتا ہے کہ ”میں نے اٹلی کے خواص اور عوام سب کو اُن لوگوں کے کارناموں سے بخوبی مطلع اور باخبر پایا جن کی تصویریں اور مورتیں تمام شاہی محلوں ، درباروں اور گزرگاہوں میں نصب کی گئی ہیں ۔ اور کچھ شک نہیں کہ اٹیلین قوم جو روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور طرح طرح کے عظیم الشان کارخانے کھول رہی ہے اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر رہی ہے ، اس کی محرک وہی نام ور لوگوں کی یادگاریں ہیں جو ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی ہیں ، اور جن کو دیکھ دیکھ کر ترقی کرنے کا خیال اور یورپ کے دولِ عظام کا مقابلہ کرنے کا جوش ہر وقت اُن کے دل میں موج زن رہتا ہے ۔“

ہم مسلمانوں میں جو آبا و اجداد کی برسی یا مشائخ و اولیاء اللہ کا عرس کرنے کا دستور ہے ، یہ بھی در حقیقت اُن کی یادگار قائم

کرنے کا ایک طریقہ ہے ۔ اور اگر ان مواقع پر اُن بزرگوں کے بڑے بڑے کارناموں کا بھی ذکر ہوا کرے تو یہ بھی ایک عمدہ یادگار ہو سکتی ہے ۔ اگرچہ جس قسم کی یادگاریں یورپ میں قائم کی جاتی ہیں ، اُن سے سلف کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے ، اور برسی کے ذریعے سے سال بھر میں صرف ایک دفعہ اُن بزرگوں کا خیال آتا ہے ، لیکن موجودہ حالت میں اگر برسویں دن بھی یہ رسم برابر ادا ہوتی رہے ، اور برسی والے بزرگ کا ذکرِ خیر مجمعِ عام میں کیا جایا کرے ، تو اس سے بھی قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔

اب میں آپ صاحبوں سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید مرحوم کے بڑے بڑے کاموں میں سے چند باتیں ، جو نہایت جلدی میں اُن کی لائف سے میں انتخاب کر سکا ہوں ، آپ کے سامنے عرض کروں ۔ مگر میرے اس بیان کو سرسید کی پوری لائف سے ایسی ہی نسبت سمجھنی چاہیے جیسی ایک نامکمل فہرست کو پوری کتاب سے ہوتی ہے ۔

غدرِ ۱۸۵۷ء کے بعد انگلش گورنمنٹ کے سخت انتقام اور سخت سزاؤں کو دیکھ کر ، جو غدر کے بعد خاص کر مسلمانوں کے حق میں آئیں ، وہ اس کے رحم اور مہربانی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے ۔ جن غلط فہمیوں کے مسلمان شکار ہو گئے تھے ، ان کے اسباب بدستور موجود تھے ۔ جہالت اور تعصب ان کے سر پر سوار تھا ۔ تمام حکم ران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی تھی ۔ انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹیکل لکھے جاتے تھے ، جن سے انگریزوں کا دل مسلمانوں سے روز بروز زیادہ پھٹتا جاتا تھا ۔ کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے تھے ، فوج میں ان کی بھرتی موقوف ہو گئی تھی ، وہ درباروں میں بہت ہی کم

بلائے جاتے تھے ، غرض کہ تمام علامتیں اس بات کی موجود تھیں کہ اب مسلمانوں کا عزت اور اعتبار کے ساتھ ہندوستان میں رہنا غیرممکن ہے ۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا ، یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا ، مگر آخر کار ان کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا ۔ علاوہ اور تدبیروں کے ، جو انھوں نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے اختیار کیں ، انھوں نے سب سے زیادہ ضروری اس بات کو سمجھا کہ گورنمنٹ نے بغاوت کے اسباب سمجھنے میں جو غلطی کی ہے اس کو نہایت دلیری سے گورنمنٹ پر ظاہر کر دیں ۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا ؛ وہ وقت نہایت نازک تھا ۔ خصوصاً مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام تھا ۔ گورنمنٹ کو غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر سب سے زیادہ تھا ، یہاں تک کہ اس وقت مسلمان ہونا ہی ایک بڑا سخت جرم سمجھا جاتا تھا ۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بالکل نہ تھی ۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی ۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیرخواہ اور وفا دار تسلیم کر لیا گیا ہو اس کو ایسی قوم کی حمایت کرنی جس کو گورنمنٹ اپنا بدخواہ سمجھتی ہو ، اور بھی زیادہ دشوار تھا ۔

الغرض انھوں نے خدا پر بھروسہ کر کے مراد آباد میں اسبابِ بغاوتِ ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایاے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں وہ تمام الزامات ، جو لوگوں کے نزدیک خود گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے ، نہایت دلیری

اور آزادی کے ساتھ بیان کیے اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں تہہ نشین تھے اُن کی تردید کی اور اُن کو غلط بتایا ۔

جب یہ رسالہ چھپ کر اُن کے پاس پہنچا اور اُن کے بعض دوستوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنا چاہتے ہیں تو انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ سرسید سے کہا کہ خدا کے واسطے ان کتابوں کو جلا دو ۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو رائے شنکر داس ، جو مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے ، آب دیدہ ہو کر خاموش ہو رہے ۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو کونسل کے معزز ممبر مسٹر سسل بیڈن فارن سیکرٹری گورنمنٹ ہند نے اُس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے ، اس سے حسب ضابطہ باز پُرس ہونی چاہیے ۔ اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے ۔ مگر چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا ہم زبان نہ تھا اس لیے اُن کی رائے پر کچھ لحاظ نہیں کیا گیا ۔ مگر کچھ دنوں بعد جب لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرسید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن نے سرسید سے تلخ لہجے میں کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیرخواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے ۔ سرسید نے کہا ”میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ممبران پارلیمنٹ کے ملاحظے کے لیے ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے ۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بہ سبب

غیظ وغضب کے حاکموں کی رائے میں سلامتی نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی اُلٹی سمجھتے ہیں ۔ پس جس طرح اُس کو میں نے ہندوستان میں شائع نہیں کیا ، اسی طرح میں نے انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا ۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے ۔ اگر اس کے سوا ایک بھی جلد کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا ۔ یہ سن کر مسٹر بیڈن سرسید سے بالکل صاف ہو گئے اور پھر ہمیشہ اُن کے دوست رہے ۔

انگلستان کے مشہور اخبار 'ہوم نیوز' نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ”سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے اُن میں بعض نہایت قیمتی اور عمل درآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں ۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی ۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکم ران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا ۔ وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربے سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے ۔

اخبار 'سینٹ جیمس بجٹ' نے اُن نتائج کے بیان کرنے کے بعد ، جو اس کتاب سے مرتب ہوئے ، اُس پر یہ ریمارک کیا تھا کہ ”ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہ نسبت اُن شکایتوں کے ، جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں ، بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے ۔“

اگرچہ ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالے کے مضامین کو بالکل تسلیم نہ کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں ، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے ، جیسا کہ

مذکورہ بالا انگریزی اخباروں کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے ، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل در آمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتابِ مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا ، وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کی وجہ سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا ؛ یعنی ١٨٦٠ع میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ١٨٦١ع میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نام زد کیے گئے۔ چنانچہ جنوری ١٨٦٢ع کے اجلاس کونسل میں پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ ، راجا دیونراین سنگھ رئیس بنارس اور راجا ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار شریک ہوئے۔ اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا مگر سرسید نے در حقیقت یہ بیج بویا تھا اُس پودے کا جو اب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے ، اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔

یا مثلاً کتابِ مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑی بڑی ذمہ داریوں کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتابِ مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد ، یعنی ١٨٦٢ع میں پہلی ہی دفعہ پنڈت شمبھوناتھ ہائیکورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے ، جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ، ملنے لگے۔

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاص کر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی ؛ بغاوت پر جتنے آرٹیکل ،

رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں۔ کہیں ان پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو اپنے مذہب کے بہ موجب عیسائیوں سے عداوت ہے ، کوئی یہ کہتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عمل داری نہیں رہنے کی۔ اور سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رُو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا ، اور اسی لیے سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔ سرسید نے ان خیالات کی تردید کے لیے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس کا نام 'لائل محمڈنز آف انڈیا' تھا اور جس میں اس بات کی شہادتیں پیش کی جاتی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیرخواہی میں جاں بازی اور جاں نثاری کے کام غدر کے موقع پر مسلمانوں سے ظہور میں آئے ، وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظاہر نہیں ہوئے۔

اس کے بعد اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو بدگمانیاں مذہبِ اسلام کی نسبت قدیم سے یورپ میں چلی آتی ہیں ، اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی حکمران قوم یہاں کے مسلمانوں کو گورنمنٹ کے حق میں نہایت خوف ناک جماعت سمجھتی ہے ، اُن کے رفع کرنے اور اسلام کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے لیے بائبل کی تفسیر لکھی جائے۔ اور جہاں تک اسلام کے اصول اہلِ کتاب کے اصول سے مطابق ہوں ، اُن میں تطبیق کی جائے ، اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے ، وہاں اختلاف کے وجوہات بیان کیے جائیں ، اور اس طرح جو بدگمانیاں عیسائیوں کو اسلام کی نسبت ہیں ، وہ رفع کی جائیں۔ نیز مسلمان جو موجودہ بائبل کو بالکل محرّف سمجھتے ہیں ، اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک وسیع سمندر کو حائل جانتے ہیں ، اُن کی اس غلطی کو بھی دور کیا جائے ، اور اس طرح دونوں

قوموں میں اتحاد پیدا کیا جائے ۔ چناں چہ غازی پور میں انھوں نے بائبل کی تفسیر بہت بڑے پیمانے پر لکھنی شروع کی اور اپنا ہزارہا روپیہ اس کام میں صرف کیا ۔ عربی اور عبرانی کے جاننے والے عالم نوکر رکھے اور کئی ہزار روپے کا پریس تفسیر چھاپنے کے لیے خریدا ، اور سرکاری کام سے جو وقت بچا وہ سب اُس کے ترتیب دینے میں صرف کیا اور بڑی بڑی جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیں ۔ لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس کا سرانجام کرنا سرسید کی طاقت اور مقدور سے باہر تھا اور نیز مسلمان پبلک نے اُس کی قدر نہیں کی ، آخرکار سرسید کو اس کام سے دست بردار ہونا پڑا ۔

۱۸۷۱ع میں ڈاکٹر ہنٹر نے ، جو ہندوستان کے مدبّرانِ سلطنت میں شمار ہوتے تھے ، ایک کتاب مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر انگریزی میں لکھ کر شائع کی ، جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے کہ جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے ، اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیرخواہ نہیں بن سکتی ۔ نیز وہابیت اور بغاوت دو ہم معنی الفاظ ہیں ۔ پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے ۔ وہ اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے ویسے ہی موجبِ خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجبِ خطر چلے آتے ہیں ۔

جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی ، یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ع کا غدر انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا ۔ دوسرے بنگالے کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا ۔ تیسرے اُنھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اُس پر اور طُرہ ہو گیا تھا ۔ ایسے وقت میں

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر پیدا کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے اُن کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا ۔

جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی ، اُس وقت سرسید پر مختلف قسم کے سرکاری اور قومی کاموں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اُن کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی ۔ باوجود اس کے اُنھوں نے سب کام چھوڑ کر اس کتاب پر ریویو لکھنا شروع کیا جو 'پایونیر' کے متعدد پرچوں میں برابر شائع ہوتا رہا ۔ اُنھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک مشرّح بیان کی ۔ اور اس بات کا اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے ۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا ، خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی ، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا ، بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا ۔ اُنھوں نے جہاد کے مسئلے کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اُس کی نسبت تھیں ، اُن کو اچھی طرح ظاہر کیا اور بتایا کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی پناہ میں ہیں اور اپنے فرائضِ مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں ، اُن کو انگریزی گورنمنٹ کے زیرِ حکومت اُسی اطاعت و فرماں برداری سے رہنا از روے اسلام واجب ہے ، جیسا کہ ہجرتِ اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ نجاشی کے زیرِ حکومت رہے تھے ۔

سرسید کے ریویو نے انگریزی حکام کے دل پر اور انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا ۔ اُن کے ایک دوست لندن میں موجود تھے اور ان کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور مسلمانوں کی نسبت بہت زہریلے خیالات

پھیل گئے ہیں ۔ اُنھوں نے سرسید کا تمام ریویو فوراً 'پایونیر' کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جابجا تقسیم کرا دیا ۔ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا یہ حال ہوا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے ۔ جو شخص اس کو پڑھتا تھا ، ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر ہنستا تھا ۔ اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا ، اُس کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا ۔

۱۶ مارچ ۱۸۷۲ع کے 'انڈین آبزرور' میں خود اُس کے یورپین ایڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اور سرسید کے ریویو پر نکلا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا اعتبار انگریزوں کے دل سے بالکل محو کر دیا تھا ۔ اسی آرٹیکل میں ایک جگہ ڈاکٹر موصوف کی نسبت لکھا تھا کہ ”غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل لبھائے گی ، مگر سرسید کے ریویو نے اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھو دی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی ۔ کتابیں پڑھنے والے ان کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھیں ، طاق پر رکھ دیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ قصے کی دل چسپ کتابوں کی مانند ہیں ، جو اپنے طرز میں نہایت دل فریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں ہوتیں ۔“

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا تھا کہ ”مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے اس سے زیادہ توقع نہیں ہے کہ وہ حکومت انگریزی کے قبول کرنے میں ضرور سرد مہری کریں گے ۔“ سرسید نے اس کا مفصل جواب دینے کے بعد لکھا کہ ”یہ بات مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اس کو نتیجہ ملتا ہے ۔

پس اگر مسلمان بہ جز سرد مہری کے قومِ حکمران کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے تو مسلمانوں کی سرد مہری سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیے ۔“ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو عیسیٰ مسیح کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ ”جس سلوک کے تم اوروں سے متوقع ہو ، تم کو بھی وہی سلوک اُن کے ساتھ کرنا چاہیے ۔“ اس ریویو کا اخیر نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ، جو وہابی مذہب کے مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ بدگمان تھی ، اور اُن کو برٹش حکومت کا بدخواہ سمجھتی تھی ، وہ بدگمانی اب بالکل جاتی رہی ہے ، اور یہ بات سب کو معلوم ہو گئی ہے کہ وہابیوں کے اصولِ مذہب کی ناواقفیت کے سبب سے تمام بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں ۔

الغرض غدر کے بعد ایک مدت دراز تک سرسید برابر ایسی تدبیریں کرتے رہے جن سے انگریزوں کے دل ، جو اس واقعے کے سبب ہندوستانیوں سے مکدر ہو گئے ہیں ، کسی طرح اُن کی کدورت رفع ہو ۔ اور خاص کر جو بدگمانیاں مسلمانوں کی طرف سے عام طور پر اُن میں پھیل گئی ہیں ، اُن کو دور کیا جائے ۔ اسی غرض سے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں قائم کی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط و اتحاد پیدا ہو ، اور علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جائیں ، اور بذریعے ترجموں کے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی جائے ۔ اور سوسائٹی سے ایک ایسا اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جاری کیا جائے ، جس سے ہندوستانیوں کے خیالات انگریزوں پر اور انگریزوں کے خیالات ہندوستانیوں پر ظاہر ہوتے رہیں ۔

پھر جب اُن کی تبدیلی غازی پور میں ہو گئی تو وہاں جا کر انھوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا ، جس کے انتظام کے لیے ہندو مسلمانوں کی متعدد کمیٹیاں مقرر کی گئیں ۔ اور

انگریزی کے سوا اُردو ، فارسی ، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی اُس میں انتظام کیا گیا ۔ یہ مدرسہ آج تک 'وکٹوریہ اسکول' کے نام سے جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اُس میں ہوتی ہے ۔

جب غازی پور سے سرسید کی تبدیلی پھر علی گڑھ ہوگئی تو یہاں آ کر انھوں نے ایک اور انجمن ۱۸۶۶ء میں قائم کی جس کا نام 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسوسی ایشن کے ذریعے سے ہندوستان کے حالات اور معاملات کی اطلاع پارلیمنٹ تک پہنچتی رہے ، اور جس طرح اینگلوانڈینز نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کی ہے اسی طرح تمام اضلاعِ شمال و مغرب کی جانب سے ہندوستانی بھی ایک ایسوسی ایشن اپنے مُلک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعے سے اپنے تمام مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچاتے رہیں ۔

۱۸۶۶ء میں انھوں نے صوبۂ مذکور میں، تعلیمی کمیٹیاں قائم ہونے کی تحریک گورنمنٹ میں کی ، اور زمین دارانِ علی گڑھ کی طرف سے ایک درخواست گورنمنٹ میں اس غرض سے بھجوائی کہ تعلیم کے انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی ، کہ علاوہ جمع مال گزاری کے ایک روپیہ سینکڑہ ہم سے لیا جاتا ہے ، دخل دیا جائے ۔ اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکامِ ضلع اور افسرانِ سر رشتۂ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں ۔ چناں چہ اول ضلع علی گڑھ اور اٹاوہ میں امتحاناً تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور آخرکار تمام اضلاع شمال مغرب میں اُن کا تقرر منظور کیا گیا ۔

۱۸۶۷ء میں انھوں نے 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کی طرف سے گورنمنٹ ہند میں اس مضمون کی درخواست بھیجی کہ اضلاعِ شمال مغرب میں ایک ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم[1] دیسی زبان میں ہوا کرے ، بشرطیکہ 'ہائی ایجوکیشن کو ، جو بذریعہ کلکتہ یونیورسٹی کے اس صوبے میں جاری ہے ، کچھ صدمہ نہ پہنچے ۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ورنیکلر یونیورسٹی سے انگلش ہائی ایجوکیشن کو ضرور صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انھوں نے یہ خیال بالکل چھوڑ دیا ۔

انھی دنوں میں سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں میں ربط اور اتحاد بڑھانے کی غرض سے ایک رسالہ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے جواز پر لکھ کر شائع کیا جس میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علما مواکلتِ اہلِ کتاب پر کرتے تھے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے سے منع کرتے تھے ، آیتوں اور حدیثوں اور فقہ کی کتابوں سے مدلل کر کے لکھا تھا ۔ اس رسالے کا جو اثر ہندوستان میں ہوا اُس کے بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اب ہندوستان میں ایسا عام ہو گیا ہے کہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی ہے اور جو اُن سے ملتے جاتے ہیں وہ عموماً اُن کے ساتھ کھانے پینے سے اجتناب نہیں کرتے ۔

غرض کہ ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۶۸ء تک وہ برابر اُن تدبیروں میں سرگرم رہے جن سے ملک اور قوم کی بھلائی متصور تھی ۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک اُن کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا ممکن نہیں ۔ اس منصوبے کے پورا کرنے کے لیے انھوں نے نہایت ضروری سمجھا کہ چند روز انگلستان میں جا کر قیام کریں اور وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر ہندوستان پہنچ کر جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی تعلیم کی

---

[1] انگریزی کی اعلیٰ تعلیم ۱۲ -

بنیاد ڈالی ۔ اس کے سوا انھی دنوں میں سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاعِ شمال و مغرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حال چار جلدوں میں شائع کیا تھا جس میں اسلام اور بانیِ اسلام پر دل کھول کر نکتہ چینی کی گئی تھی ۔ جس وقت سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی ، سرسید کو اُس کی تردید لکھنے کے خیال نے بے چین کر رکھا تھا ۔ مگر اُس کی تردید لکھنے کے لیے جن کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نایاب تھے اور صرف ’برٹش میوزیم‘ یا ’انڈیا آفس‘ کے کتب خانوں میں مل سکتے تھے ۔

لیکن سرسید احمد خاں جیسے بے سرمایہ آدمی کا ولایت جانا اور وہاں جا کر ایک جنٹل مین کی حیثیت سے قیام کرنا بہ ظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا ۔ مگر وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے ، حسنِ اتفاق سے انھی دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین تین ہزار روپیہ خرچہٗ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کے نو وظیفے چند صوبوں کے واسطے منظور کر لیے ، اور صوبہٗ اضلاع شمال و مغرب کا وظیفہ سید محمود مرحوم کو مل گیا ۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرسید کے ارادے کو بہت تقویت ہوئی ۔ الغرض انھوں نے اس غرض کے لیے گورنمنٹ سے رخصت کی درخواست کی اور بعد منظوریِ رخصت کے اپنی کتابیں اور اثاث البیت بیچ کر اور گھر اور کوٹھی کو رہن رکھ کر مع سید حامد اور سید محمود کے یکم اپریل ۱۸۶۹ع کو بنارس سے انگلستان روانہ ہو گئے ۔

سرسید کے اس سفر کا مفصل حال بہت طول طویل ہے اس لیے اُن کے ایک معزز دوست کی تحریر سے ، جو اُن کے سفر انگلستان کے متعلق لکھی گئی تھی ، ہم ذیل کی چند سطریں اس مقام پر نقل

کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ’’سید احمد خاں ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو ، جو اس وقت تمام اقوامِ روے زمین پر شرف رکھتی ہے ، انھی کے ملک اور انھی کے گھروں میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلائیں ۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ ، تھیٹر ، پارک ، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامیِ دینِ اسلام کتب خانے میں بیٹھا ہوا سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا ۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا ، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے ۔‘‘

سرسید نے ولایت میں سترہ مہینے قیام کیا ۔ اس عرصے میں انھوں نے اُس مشکل سبق کے علاوہ جو مسلمانوں میں تعلیم و تربیت پھیلانے کا وہاں رہ کر سیکھا تھا ، سر ولیم میور کی کتاب کا جواب بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر انگلستان ہی میں شائع کیا ۔ ایک انگریز جان ڈیون پورٹ نام ، جس نے مسلمانوں کی حمایت میں عیسائیوں کے برخلاف ایک کتاب موسوم بہ ’’اپالوجی‘‘ لکھی تھی اور اُس کے چھپوانے کی استطاعت نہ رکھتا تھا ، اس کو ہندوستان سے سرسید نے چندہ جمع کرا کے چھپوایا ؛ اور چند اسی قسم کی کتابیں جو انیسویں صدی کے شروع میں بعض منصف مزاج انگریزوں نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھیں اور اب نایاب ہو گئی تھیں ، اُن کو بڑی جستجو سے بہم پہنچایا اور اس میں سے بعض کا ہندوستان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا ۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب جس کا نام ’خطبات احمدیہ‘

ہے ، اُس پر مفصل ریویو کرنا اور اُس کی خوبیاں آپ صاحبوں کے سامنے اس وقت بیان کرنا بہت مشکل ہے ۔ مگر چند لائق انگریزوں نے جو اس کتاب کی نسبت عمدہ رائیں لکھی ہیں ان کا مختصر طور پر یہاں ذکر کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

اخبار 'انکوائرر' نے اُسی زمانے میں 'خطبات احمدیہ' پر ایک مبسوط آرٹیکل لکھا تھا جس میں اُس نے اقرار کیا تھا کہ مصنف نے لٹریچر کے مردِ میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے ۔ وہ ایک موقع پر ، جہاں سرسید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا ، لکھتا ہے کہ ''بے شک ہیئت اور طب یہ دونوں علم ، اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے عیسائی مذہب کو عطا کیے ہیں ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر اُن کی شکر گزار ہوں گی ۔ اُن فوائد میں سے ، جو مسلمانوں سے عیسائیوں کو پہنچے ، یہ دو فائدے اگرچہ اہم ہیں مگر سچ یہ ہے کہ جو زبردست تحریک یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی وہ مذکورۂ بالا فوائد پر منحصر نہیں ہے بلکہ فنِ تعمیر ، شاعری ، معاشرت اور آداب سب پر اُس کا کافی اثر پہنچا ہے ۔''

اسی کتاب میں ایک جگہ عیسائیوں کے اس طعن کا جواب دیتے وقت کہ اسلام کی بنیاد محض عیسائی اور یہودی مذہب پر رکھی گئی ہے ، سرسید نے لکھا تھا کہ مسلمان اپنی سب سے بڑی عزت یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سچے اور ایمان دار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے ۔ اس پر ریویو نگارِ مذکور لکھتا ہے کہ ''یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں ۔ ان پر فی الحقیقت کتھولسٹی کے سچے اصول کی مہر ہے ۔ فی الواقعہ اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی

اصول ہے اور بس ۔''

ریورنڈ ہوپر ، جو ایک زمانے میں لاہور ڈیونیٹی کالج میں پرنسپل تھے ، انھوں نے اسی کتاب کے متعلق میرے ایک دہلوی دوست سے کہا تھا کہ ''ہمارے نزدیک جو کام سرسید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے ، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا ہے ۔ جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں ، تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گم راہ سمجھتے ہیں ، اُن پر اسلام کی خوبی ظاہر کرتے ، اُن کے ملکوں میں جا کر انھی کی زبان میں وعظ کہتے یا انھی کی زبان میں اسلام کے حق ہونے پر کتابیں لکھتے ۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو ۔''

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں 'خطبات احمدیہ' کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا غیر معمولی تعمقِ نظر ، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب . . . جو لوگ مذہبی باتوں سے دل چسپی رکھتے ہیں ، ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں ۔ دین محمدی فی زمانِنا انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متّہمِ دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں ، جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے ۔ وہ عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے ، اور اُس میں ہر ایک چیز تعصب ، مغایرت اور تنگ دلی کی خیال کی جاتی ہے ۔ لیکن ہمارے ناظرینِ کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں ، جب سید احمد خاں کی 'خطبات احمدیہ' کو غور سے پڑھیں گے ، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر

آٹھیں گے۔ سید احمد خاں نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا ہے جس میں مصنف پر خوب لے دے کی ہے۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور سمجھ دار ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔''

مذکورۂ بالا رایوں سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ 'خطبات احمدیہ' نے انگریزوں کے دل پر کیسا عمدہ اثر کیا تھا اور جو کتابیں قدیم مخاصمانہ طریقے کے برخلاف شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں، وہ کس قدر مفید اور فریقِ ثانی کو کس قدر انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

سرسید نے ولایت سے ہندوستان میں آ کر جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کام مسلمانوں کی حقیقی اور اصلی بھلائی کا کیا، اور جس سے میری مراد علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قائم کرنا ہے، اس کی عظمت اور بڑائی سے سب لوگ واقف ہیں اور اس کی نسبت زیادہ تفصیل بیان کرنے کی اس موقع پر ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم نہایت مختصر طور پر اس کی ابتدا اور جس حد تک اس نے اب تک ترقی کی ہے، اس کا ایک خاکہ کھینچ کر حاضرین کو دکھانا چاہتے ہیں۔

ولایت جانے سے پہلے سرسید احمد خاں نے اپنے ایک معزز بزرگ سے برسبیل تذکرہ یہ الفاظ کہے تھے کہ ''اگر مسلمانوں کی تعلیم کا سامان مہیا کرنے کے لیے مسلمانوں سے چندہ جمع کیا جائے، تو آپ کے نزدیک دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' وہ یہ الفاظ سن کر بے اختیار ہنس پڑے اور کہا کہ ''یہ تمھارے ویسے ہی شیخ چلی کے سے منصوبے ہیں جو تم ہمیشہ باندھا کرتے ہو۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں سے اس کام کے لیے بجائے دس لاکھ

کے دس روپے کے ملنے کی بھی امید نہیں ہے۔''

صاحبو! یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں ہے کہ جس درس گاہ کے لیے ۱۸۶۸ء میں چھ کروڑ مسلمانوں سے دس لاکھ روپے وصول ہونا محال سمجھا جاتا تھا، آج اس کی شہرت اور مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ بمبئی کے ایک مسلمان تاجر نے انھی دنوں میں اس کے لیے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ دیا ہے، اور اس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ اور صرف اس کی عمارات پر دس لاکھ سے بہت زیادہ اب تک خرچ ہو چکا ہے۔ اور جس مدرسے کا ۱۸۷۵ء میں قوم کی مخالفت کے سبب ہائی اسکول کے درجے تک پہنچنا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا، اب وہی قوم اس کو یونیورسٹی بنانے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ جس مدرسے میں کوئی دہلی یا علی گڑھ کا مسلمان بھی اپنے لڑکے کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا، آج اسی میں پنجاب، ممالک متحدۂ بنگال، مدراس، برہما، آسام، گجرات، بلوچستان، افغانستان اور ایران تک کے سات سو مسلمان بورڈر تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔

علی گڑھ محمڈن کالج سے جس قدر مسلمانوں نے اب تک تعلیم میں ترقی کی ہے، اس کو اعداد کے ذریعے سے ہم اس وقت ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے۔ ہم کو اس امر کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں، اس وقت سے لے کر ۱۸۸۱ء تک، یعنی اس وقت تک کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۴۳ تک پہنچی تھی، مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف ۱۲ سال میں تمام ہندوستان کے گریجویٹس کی تعداد ۴۳ سے بڑھ کر ۳۹۹ تک پہنچ گئی۔

سرکاری ملازمت میں جو پست حالت مسلمانوں کی تھی اُس کا کسی قدر اندازہ 'پایونیر' مورخہ ۱۸۷۰ع کے اس فقرے سے ہو سکتا ہے جو اُس نے صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ ''تمام بنگال میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پنشن لینے والے ہیں ، اور اُن کی جگہ پر یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا ۔ اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نظر نہ آئے گا ۔'' اگرچہ 'پایونیر' نے یہ فقرہ بنگال کی نسبت لکھا تھا لیکن اگر سرسید کی چیخ پکار سے شمالی ہندوستان میں تعلیم کا چرچا نہ پھیل جاتا تو یہی حال پنجاب اور اضلاع شمال و مغرب میں مسلمانوں کی سرکاری ملازمت کا ہونے والا تھا ۔ لیکن جب سے علی گڑھ کالج کے اعلیٰ امتحانوں کے نتیجے نکلنے لگے ہیں ، اُس وقت سے مسلمان ملازموں کی تعداد معزز عہدوں پر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مسلمان بیرسٹروں اور وکیلوں کا شمار بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے ۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت سر آکلینڈ کالون نے ، جب کہ وہ اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر تھے ، کہا تھا کہ ''جو شخص اُن نوجوانوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلتے ہیں ، وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹس ظاہر کرتے ہیں ۔ علی گڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے ۔''

سر سید نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے صرف محمڈن کالج ہی کے قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرس' اسی غرض سے ۱۸۸۶ع میں قائم کی جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا غل ڈال دیا ۔ انھوں نے ایک دوسری

ایسوسی ایشن 'محمڈن سول سروس فنڈ' کے نام سے اس لیے قائم کی کہ قومی چندے سے مسلمان طالب علموں کو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لیے انگلستان بھیجا جائے ۔ انھوں نے جب دیکھا کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہائی ایجوکیشن کو گھٹا کر مشرقی تعلیم کو ترقی دینے کا ہے اور لارڈ رپن کی اسپیچ سے ، جو لاہور میں اہل پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے دی تھی ، اُن کو یقین ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا نام و نشان باقی نہ رہے گا ، تو انھوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا اور اہل پنجاب میں سے جو لوگ انگریزی تعلیم کی جگہ مشرقی تعلیم پر پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد رکھنی چاہتے تھے اُن کے خیالات بالکل بدل گئے ۔ پھر جب ۱۸۸۹ع میں الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر قائم ہونے لگی جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دی جائے ، تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اُسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسی کہ پنجاب یونیورسٹی کی کی تھی ۔ جو زبردست آرٹیکل اُنھوں نے الہ آباد یونیورسٹی پر لکھا تھا اُس میں انھوں نے صاف صاف لفظوں میں تحریر کیا کہ ''اگر بالفرض یہ یونیورسٹی مغربی تعلیم کی سد راہ ہو تو ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی

ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ اُس کو بلاشبہ لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر اُن کی رایوں پر نہیں ۔''

اگرچہ بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ فی الواقعہ انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا چاہتی ہے اور سرسید کی تحریروں نے گورنمنٹ کی پالیسی پر کچھ اثر کیا یا نہیں ، لیکن اس میں شک نہیں کہ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ ، جو دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اعلی مغربی تعلیم کی جڑ کاٹنے والی ہوں گی ، ویسا ظہور میں نہیں آیا ۔ دونوں یونیورسٹیوں نے اب تک کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہیں کیا جو انگلش ہائی ایجوکیشن کی گاڑی میں روڑا اٹکانے والا ہو ۔

سر سید نے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم کے پھیلانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مغربی علوم سے جو مضر نتیجے مذہبی دنیا میں عموماً پھیل رہے ہیں اور روز بروز زیادہ پھیلتے جاتے ہیں اُن کے انسداد میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا ۔ اُن کو معلوم تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں ، خواہ ہندو ہوں ، خواہ مسلمان ، خواہ عیسائی ، اُن کے دل میں ، مستثنی صورتوں کے سوا ، عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی ۔ وہ مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا مدرسے میں ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلے کا ثبوت اُن کو ملتا رہتا ہے ۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ اُلوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کی حقارت اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے ۔ سر سید کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت یورپ کے اکثر ملکوں میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا اور عیسائی مذہب کمزور ہوتا جاتا ہے ، اس لیے انھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا

ہوں ، اُس کی مضرتوں کا انسداد کرنا بھی اپنا فرض سمجھا ۔ وہ ابتدا سے وقتاً فوقتاً 'تہذیب الاخلاق' میں اُن شبہات کے جواب برابر لکھتے رہے جو سائنس کی رو سے اصول اسلام پر وارد ہونے ممکن تھے ۔ انھوں نے اسی غرض سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی جس کو باوجود طرح طرح کے موانع اور ہجوم مشاغل کے وہ برابر اوقاتِ فرصت میں لکھتے رہے اور نصف سے زیادہ قرآن کی تفسیر سات جلدوں میں لکھ کر چھوڑ گئے ۔

صاحبو! میں اُس مرحوم کی کس کس بات کو بیان کروں ۔ اُس کی پچاس برس کی کوشش سے جو عظیم الشان فائدے ملک اور قوم کو پہنچے ہیں اور جو جلیل القدر خدمتیں دین اسلام کی اُس سے ظہور میں آئی ہیں ، اُن کا ان چند سطروں میں آپ کے روبرو بیان کرنا میرے لیے بلامبالغہ ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے دریا کا کوزے میں بند کرنا ۔ شمالی ہندوستان میں جس قدر انجمنیں ، سوسائٹیاں ، سبھائیں اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں ، جس قدر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ملک کے اطراف و جوانب میں مذہبی اور علمی درس گاہیں قائم کی ہیں ، اور جس قدر اُردو ، ہندی اور سنسکرت میں ۳۶ برس کے عرصے میں تالیفات اور تصنیفات اور تراجم ملک میں شائع ہوئے ہیں ، اور جس قدر اُردو اور ہندی اخبارات اور رسالے ملک کے ہر گوشے میں جاری ہوئے ہیں ، اگر غور کرکے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک انسانِ ضعیف البنیان کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے ۔ اگر میرے ان تمام دعووں کا ثبوت کسی صاحب کو درکار ہو تو وہ 'حیات جاوید' (سر سید کی لائف) کو ملاحظہ کریں ۔ مگر مثال کے طور پر میں یہاں صرف اُردو لٹریچر کی ترقی کا ذکر کرتا ہوں ۔

جو لوگ اُردو لٹریچر اور اُس کی ترقی سے دل چسپی رکھتے ہیں ، وہ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اُردو لٹریچر کی ترقی اُس انعامی اشتہار کے اجراء کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے جو ۲۶ اگست ۱۸۶۸ع کو گورنمنٹ شمال و مغرب نے جاری کیا تھا اور جس نے ۳۶ برس کے عرصے میں ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک نہ صرف اُردو بلکہ اکثر دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا ۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں ، جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا ، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا ۔ اُن لوگوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور وہ خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے ۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس لٹریری ترقی کا باعث بھی وہی مرحوم تھا ۔ سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے بہ مقام علی گڑھ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حضور میں جو ایڈریس ۹ مئی ۱۸۶۸ع کو پیش کیا تھا اُس میں درخواست کی تھی کہ جو کتابیں دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں اُن کی گورنمنٹ کی طرف سے قدردانی ہونی چاہیے اور ہز آنر نے ایڈریس کے جواب میں وعدہ کیا تھا کہ اس درخواست پر ضرور لحاظ کیا جائے گا ۔ چناں چہ ۲۶ اگست ۱۸۶۸ع کو یعنی ایڈریس پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ ممدوح نے مذکورۂ بالا انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا ۔ یہ تو اُردو کی عام اور سطحی ترقی کا حال تھا ، مگر اُس کی اصلی اور حقیقی ترقی کی بنیاد خود سر سید نے اپنے پُرزور

ہاتھوں سے ڈالی ہے جو ‘علی گڑھ گزٹ’ ، ‘تہذیب الاخلاق’ اور سرسید اور اُن کے دوستوں کی تحریرات کے ذریعے سے ظاہر ہوئی ہے ۔

اگرچہ سر سید کی مخالفت اب ملک اور قوم میں بہت کم ہو گئی ہے مگر اب بھی کسی قدر اُن کے مخالف نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی ایسے موجود ہیں جو نہ صرف سر سید کی تصنیفات پر بلکہ اُن کے اخلاق و عادات پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مخالفوں کی نکتہ چینی بالکل درست ہے ، تو بھی کوئی مسلمان ، جس کے دل کی آنکھ میں بصیرت کا نور باقی ہے ، سر سید کے ان تمام کاموں پر ، جو روز روشن کی طرح تمام عالم پر ظاہر ہیں ، خاک نہیں ڈال سکتا ۔ نواب عمادالملک نے نظام کلب کے جلسۂ دعوت میں جو ۱۸۹۱ع میں سر سید کے لیے منعقد ہوا تھا ، اُن لوگوں کے جواب میں ، جو سر سید کے ہر ایک کام کو حبِّ جاہ اور ناموری و شہرت کی خواہش پر محمول کرتے ہیں ، نہایت عمدہ بات کہی تھی کہ ”کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں جیسا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے ہی مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اُس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں ۔“

احمد زکی آفندی نے جو ۱۸۹۲ع میں یورپ کا سفر کیا ہے ، اس کے ذکر میں یورپ کے اکثر محبان وطن مثل گیری بالڈی ، نیلسن گیمبٹا اور ملکۂ کیتھرائن وغیرہ کا حال اور اُن کے اخلاق عیوب بیان کر کے لکھتا ہے کہ ”اہل یورپ اپنے اپنے ملک کے محبانِ وطن اور خادمانِ قوم کے شخصی اور خانگی کاموں کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ، کبھی نہیں دیکھتے ، اور کبھی بھول کر بھی اُن کی برائیوں کا ذکر زبان پر نہیں لاتے ؛ بلکہ ہمیشہ اُن کے عام

اور مفید کاموں کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے اپنی کوشش سے اپنے ملک کو پہنچائے ہیں۔ طرح طرح سے ان کا نام زندہ کرتے ہیں اور اُن کا ذکر خیر اعلیٰ علیین تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اٹلی۔ فرانس اور انگلستان کو آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اُن کے رعب و داب کے آگے دنیا بھر کا سر جھکا دیا ہے۔"

مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایک محب وطن اور خادمِ قوم کی یہ قدر کی جاتی ہے کہ جب اس میں بظاہر کوئی اخلاقی عیب یا کمزوری نظر نہیں آتی تو اُس کی نیت اور اس کے دل کو ٹٹولتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ڈنک مارتے ہیں۔ اور گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس وحی آئی ہے کہ یہ شخص بظاہر جتنے کام قوم کی بھلائی کے کرتا ہے اُن سے اُس کی غرض اپنی نمُوری اور شہرت بڑھانے اور گورنمنٹ میں اپنا اعزاز زیادہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور ہم میں ایسے لوگ پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں جو اپنی کوشش سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ برخلاف اس کے ہم ہندوستان کی دیگر ہمسر قوموں میں برابر دیکھتے ہیں کہ ان میں ایسے جواں مرد اور محب وطن بکثرت پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، کیوں کہ اُن کی قوم اُن کی عزت کرتی ہے اور اُن کے قدموں کے تلے آنکھیں بچھاتی ہے۔ اور ہرگز اپنے صوبے کے گورنر کی بھی ایسی تعظیم و تکریم نہیں کرتی جیسی اپنے ملک اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی عزت کرتی ہے۔

اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور خاتمے پر ایک بند سرسید کے مرثیے کا پڑھتا ہوں جس کے مضمون پر غور کرنا، امید

ہے کہ میرے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے حق میں مفید ہوگا[1]:

میتواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن
میتواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں برد
میتواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن
میتواں در ملک و دولت خسروِ پرویز گشت
میتواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن
میتواں قطبِ زماں شد میتواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی میتوانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی طپیدن از تپِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابناے جنس
در شبستاں تنگدل از محنتِ زنداں شدن
آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن

---

[1] ۱- یہ اشعار در اصل اُس مشہور مرثیے کے ہیں جو حضرت مولانا حالی نے سرسید کی وفات پر ایک ترکیب بند کی صورت میں تصنیف کیے تھے۔ یہ پورا ترکیب بند "ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی" (از صفحہ ۳۴ تا ۳۷) میں چھپا ہوا موجود ہے۔ مگر اس موقع پر مولانا حالی کو اُن کے حد سے بڑھے ہوئے انکسار نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ فرماتے کہ "یہ اشعار میرے ہیں اور میں نے سر سید کے انتقال پر کہے تھے" صرف اس موقع پر موقوف نہیں، اپنی تمام تصنیفات اور تقریروں میں تقریباً ہر جگہ مولانا نے یہی روش اختیار کی ہے اور کہیں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ (محمد اسماعیل)

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
گر توانی میتوانی سید احمد خاں شدن

میتواں مقبولِ عالم گشت امّا ہمچو شیخ
بہرِ سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن

جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

۹

تقریر متعلق وکٹوریہ میموریل لائبریری پانی پت

۱۹۰۱ع میں جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو ہندوستان کے ہر شہر میں ماتمی جلسے کیے گئے۔ پانی پت میں بھی جلسہ ہوا۔ اُس جلسے میں ایک تجویز یہ پاس ہوئی کہ حضور قیصرۂ ہند ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کی پانی پت میں ایک یادگار قائم کی جائے۔ پانی پت کا تحصیل دار جو جلسے کا صدر تھا اُس نے یہ تحریک کی اور سرکاری اثر کے ماتحت عوام سے تین ہزار روپے سے زیادہ چندہ جمع کر لیا جو ایک مہاجن کے پاس اماناً رکھ دیا گیا۔ مگر وہ ایک وقتی جوش اور دودھ کا سا اُبال تھا۔ بعد میں کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ کوئی یادگار قائم ہونی چاہیے۔ اس طرح دن گزرتے گئے اور جمع شدہ روپیہ یونہی پڑا رہا اور وہ مہاجن اُس روپے کو سود پر دیتا اور نفع کماتا رہا۔ ۱۹۰۵ع میں مولانا حالی کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس جمع شدہ روپے کو کسی اچھے مصرف میں لایا جائے۔ اس پر انھوں نے شہر کے چند معززین کو جمع کر کے اُن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس روپے کے خرچ کرنے کا کوئی بہتر

مصرف سوچا جائے ، کیونکہ تین ہزار روپے میں کوئی بڑی عمارت بطور یادگار نہیں بن سکتی ۔ لہٰذا صلاح یہ ہوئی کہ قصبے کے میونسپل بورڈ مڈل اسکول کو ترقی دے کر ہائی اسکول بنا دیا جائے اور اس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے ۔ مگر اس کے لیے بھی یہ رقم کافی نہ تھی اور مزید خرچ میونسپل کمیٹی نے دینا نہ چاہا ، اس لیے یہ تجویز رہ گئی ۔ اس کے بعد مولانا نے پھر لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ میرا یہ خیال ہے کہ اس روپے سے ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کی یاد میں ایک لائبریری قائم کر دی جائے کیونکہ شہر میں اس وقت تک کوئی لائبریری نہیں ۔ اس طرح لوگوں کی ایک علمی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی اور ملکہ کی یادگار بھی بن جائے گی ۔

اس تجویز کو سب لوگوں نے پسند کیا اور لائبریری کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی بن گئی ۔ کتابوں کے انتخاب اور خریداری کا کام مولانا حالی کے سپرد ہوا اور وہی اس کے سیکرٹری قرار پائے ۔ مولانا نے حکیم تجمل حسین نامی ایک صاحب کو جو کیرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے اور عربی فارسی کے اچھے فاضل تھے ، لائبریرین مقرر کیا اور وکٹوریہ میموریل پبلک لائبریری کے نام سے ۱۹۰۵ء میں لائبریری کا افتتاح کر دیا ۔ اس کے لیے عربی ، فارسی ، اردو اور انگریزی کی منتخب کتابیں منگوا لی گئیں اور لائبریری جاری کر دی گئی ۔ ابھی لائبریری کو قائم ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا کہ ڈپٹی کمشنر کرنال کا حکم پہنچا

کہ لائبریری میونسپل کمیٹی پانی پت کے سپرد کر دی جائے ۔ اس پر مولانا حالی نے پھر معززین شہر اور ارکان لائبریری کمیٹی کو جمع کیا اور اُن کے سامنے ڈپٹی کمشنر کا حکم رکھ دیا ۔ اس موقع پر جو تقریر لائبریری کے متعلق مولانا نے کی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ یہ تقریر مولانا کے ذاتی مسودات میں سے نقل کی گئی ہے ۔

یہ لائبریری بعد میں مقامی میونسپل کمیٹی ہی کے پاس چلی گئی تھی اور وہی اس کا انتظام کرتی تھی ۔ مولوی حکیم تجمل حسین صاحب کے انتقال کے بعد خاکسار راقم الحروف بھی کچھ دنوں تک اس لائبریری کا لائبریرین رہا ہے ۔ ۱۹۴۷ء تک یہ لائبریری علیٰ حالہ قائم تھی مگر تقسیم ملک کے بعد اس کی تمام کتابیں ردی کے بھاؤ بیچ ڈالی گئیں ، کیونکہ جس بڑے ہال میں کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں وہ پبلک جلسوں کے لیے درکار تھا اور کتابوں سے جگہ گھرنے کے علاوہ کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ لائبریرین کی تنخواہ گھر سے دینی پڑتی تھی ۔ (محمد اسماعیل)

جناب صدر انجمن و جملہ حاضرین جلسہ !

آپ سب صاحبوں کو آج اس جلسے میں ایک ایسے کام کے لیے تکلیف دی گئی ہے جو تمام قصبے کی بھلائی سے علاقہ رکھتا ہے اور قصبے کا ہر ایک باشندہ اس میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے ۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ حضور ملکہ معظمہ مرحومہ کی وفات پر شہر کے تمام باشندوں نے نہایت جوش وفاداری سے اُس نیک دل ملکہ کی (جس کی نیکی تمام دنیا میں مشہور ہے) ایک علمی یادگار

قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا ۔ چناں چہ اس کام کے لیے عام چندے کی فہرست کھولی گئی اور شہر کے عام باشندوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے اس میں اپنی اپنی حیثیت اور مقدور کے موافق چندہ دیا ، یہاں تک کہ چندے کی تعداد کچھ اوپر تین ہزار تک پہنچ گئی ۔ اولاً سب کی یہ رائے تھی کہ قصبے میں جو مڈل اسکول ہے اس کو بیادگار ملکہ مرحومہ دو جماعتیں اور اضافہ کر کے ہائی اسکول بنا دیا جائے ۔ مگر چونکہ میونسپل کمیٹی کی امداد کے بغیر ہائی اسکول قائم ہونا ممکن نہ تھا اور کمیٹی میں اس وقت روپے کی کمی تھی ، اس لیے وہ تجویز پوری نہ ہو سکی ۔ آخر یہ راے قرار پائی کہ چندے کے روپے سے ایک کتب خانہ شہر میں قائم کیا جائے جس سے تمام باشندے برابر فائدہ اٹھاسکیں ۔ اس رائے کو جناب ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور جناب آغا سید جلال شاہ صاحب تحصیل دار نے بھی پسند کیا ۔ اور چوں کہ سنہ[1] میں ڈرمنڈ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر سابق کی تجویز سے کتب خانے کے واسطے یہ مکان کئی ہزار کی لاگت سے تیار ہو چکا تھا اور اس کی تیاری میں بھی پبلک ہی کا روپیہ جو جوبلی کے اخراجات سے بچ رہا تھا ، خرچ ہوا تھا اس لیے ۱۹۰۵ع میں یہ کتب خانہ اس مکان میں قائم کیا گیا ۔ چوں کہ اس قصبے میں ایک عام کتب خانے کا قائم ہونا جس سے ہر پڑھا لکھا آدمی فائدہ اٹھا سکے ، بالکل ایک نئی بات ہے اس لیے اصل مطلب بیان کرنے سے پہلے میں کتب خانے کے فوائد کے متعلق چند الفاظ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں ۔

آپ کو معلوم ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہوتی ہے کہ طالب علم اپنی تعلیم پوری

---

[1] مولانا کے لکھے ہوئے جس مسودے سے یہ تقریر نقل کی گئی ہے ، افسوس ہے کہ اس میں سنہ کی جگہ 'چھوٹی ہوئی تھی ۔

کرنے کے بعد اگر کسی علم یا فن میں کمال حاصل کرنا چاہے تو کتابوں کے مطالعے سے ، بغیر استاد کی مدد کے کمال حاصل کر سکتا ہے ، لیکن جب تک کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود نہ ہو کسی علم کی تکمیل نہیں ہو سکتی ۔ اسی واسطے یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس میں کم سے کم ایک یا دو عام کتب خانے موجود نہ ہوں ۔ یہ کتب خانے لوگوں کے عام چندے سے قائم کیے جاتے ہیں اور بستی کا ہر ایک باشندہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ ایسے کتب خانے کو پبلک لائبریری کہتے ہیں ۔ یورپ میں جو ہمیشہ بڑے بڑے عالم اور مصنف اور موجد اور صناع پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہاں کے تمام ملکوں میں علم کا جو دریا بہتا نظر آتا ہے وہ انھی پبلک لائبریریوں کا صدقہ ہے ۔ ہمارے قصبے کے اکثر اصحاب اس لائبریری کو بالکل بے سود اور نکمی چیز سمجھتے ہیں اور کتابوں کے خریدنے میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اُس کو روپے کا ضائع کرنا جانتے ہیں ۔ سبب یہ ہے کہ نیا کام کیسا ہی مفید ہو ، اول اول لوگ اس سے ہمیشہ وحشت اور نفرت کیا کرتے ہیں ۔ سنا ہے کہ یورپ میں جب گھنٹہ ایجاد ہوا تو جس شخص نے سب سے پہلے اس کو خرید کر اپنے کمرے میں رکھا ، اُس کو تمام رات گھنٹے کی کھٹ کھٹ سے نیند نہ آئی ، مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی آواز سے ایسا مانوس ہو گیا کہ اُس کے بغیر اس کو نیند نہ آتی تھی ۔ جب پانی پت میں اول ہی اول مدرسہ قائم ہوا تو بہت ہی کم لوگ اس میں اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے بھیجتے تھے ، مگر اب ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ یہاں بجائے مڈل اسکول کے ہائی اسکول قائم ہو جائے ۔ اسی طرح اول اول شفاخانے میں بہت ہی کم لوگ علاج کے لیے جاتے تھے مگر اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شہر میں دو شفاخانے جاری ہو جائیں اور بڑے شفاخانے میں ہوسپٹل

اسسٹنٹ کی جگہ اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا جائے ۔ امید ہے کہ اسی طرح ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اس لائبریری کو شہر کے حق میں ایک چشمۂ فیض سمجھیں گے ، اور گو اُس وقت ہم نہ ہوں گے مگر جن لوگوں کی کوششوں سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے ، ہمارے بعد اُن کی دل سے قدر کریں گے اور اُن کو شہر کا خیرخواہ سمجھیں گے ۔

اب میں اصل مطلب ، جس کے لیے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے ، بیان کرتا ہوں ؛ ایک روبکار محکمۂ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے بنام صاحب پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۶ع اس مضمون کی صادر ہوئی ہے کہ چوں کہ لائبریری کی ذمہ داری ممبران میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی ہے ، ان کو چاہیے کہ کمیٹی اول لائبریری کا چارج لے لے اور پھر ایک سب کمیٹی مقرر کرے جس میں ۳ یا ۵ ممبران لائبریری کے لیے مقرر کیے جائیں ۔ اسی روبکار میں کمیٹی سے ایک ایسا نقشہ طلب کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو کہ خرچ کرنے کا اور فنڈ اور لائبریری کے انتظام کا کس طرح بندوبست کیا جائے گا ۔

اس روبکار کا منشا جیسا کہ ظاہر ہے ، صاف یہ پایا جاتا ہے کہ لائبریری اور اُس کے انتظام کو میونسپل کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے ۔ لیکن ہم کو اس حکم کی تعمیل میں چند عذرات ہیں اور ہم کو امید ہے کہ جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ان عذرات پر ضرور لحاظ فرمائیں گے ۔

۱۔ یہ لائبریری پبلک کے چندے سے حضور ملکہ معظمہ کی یادگار میں قائم ہوئی ہے اور اس لیے بغیر مرضی چندہ دہندگان کے میونسپل کمیٹی کے سپرد نہیں ہو سکتی ۔

۲۔ شہر کے عام باشندے میونسپل کمیٹی کو ایک سرکاری محکمہ سمجھتے ہیں ۔ پس اگر لائبریری میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی تو سب لوگ اس کو ایک سرکاری کتب خانہ سمجھیں گے اور ان کو اس کے ساتھ بالکل دلچسپی باقی نہ رہے گی ۔

۳۔ بعض ممبران نے بیس پچیس روپے کی کتابیں اپنی طرف سے لائبریری کی نذر کی ہیں اور کچھ اوپر سو روپے کی عربی کی نایاب کتابیں سکریٹری حیدر آباد سے پبلک لائبریری کے لیے اپنے ساتھ لایا ہے جو سرکار نظام کے مطبع سے ہماری لائبریری کو مفت عطا ہوئی ہیں ، اور کچھ اور کتابیں عنقریب آنے والی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ لائبریری کو اس قسم کی امداد اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ پبلک لائبریری سمجھی جائے ، اور اس کی ترقی میں لوگ اسی حالت میں کوشش کریں گے کہ اس کو شہر کے عام باشندوں کا کتب خانہ سمجھیں ۔ لیکن اگر وہ ایک سرکاری کتب خانہ تصور کیا گیا تو پبلک کا شوق سرد پڑ جائے گا اور لوگوں کی آمدورفت کتابوں اور اخباروں کے مطالعے کے لیے بند ہو جائے گی اور اس طرح لائبریری کا چند روز میں خاتمہ ہو جائے گا ۔

۴۔ یہ لائبریری اُس چندے سے قائم کی گئی ہے جو شہر کے عام باشندوں نے حضور ملکہ معظمہ کی یادگار قائم کرنے کے لیے بغیر کسی حاکم یا افسر کے دباؤ کے بڑے شوق سے ادا کیا ہے ۔ ایسی لائبریری کو پبلک کے ہاتھ سے نکال کر میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں دے دینا یقیناً اُن کی دل شکنی کا باعث ہوگا ۔

۵۔ لائبریری ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور ہماری آرزو ہے کہ اس کو اس درجے تک ترقی دی جائے جو حضور ملکہ معظمہ کی یادگار کے شایاں ہو ۔ لیکن میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ہم کو امید نہیں ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری ہو سکے ۔ میونسپل کمیٹی کے ذمے پہلے ہی رفاہ عام کے بہت سے کام

ہیں ۔ وہ زیادہ سے زیادہ لائبریری کو اپنی نگرانی میں حالتِ موجودہ پر قائم رکھ سکتی ہے لیکن اس کو ترقی دینا اور اس کے لیے ہر علم و فن اور ہر زبان کی کتابیں مہیا کرنا اور بک سیلروں سے خط و کتابت کرنا اور اُس کا حساب کتاب صاف رکھنا اور اُس کی جانچ پڑتال کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے ۔

۶- بے شک ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسے پبلک فنڈ کی طرف سے ، جیسا کہ وکٹوریہ میموریل فنڈ ہے ، ضلع کے حاکم اعلیٰ کو مطمئن کرنا اور اُس کا حساب کتاب ہر وقت صاف رکھنا لائبریری کمیٹی کا فرض ہے ۔ چناں چہ اسی خیال سے ہم نے صاحبان ڈپٹی کمشنر کو (جو کوئی ہو) لائبریری کا پیٹرن یعنی مربی و سرپرست ہمیشہ کے لیے قرار دیا ہے اور اس کی اطلاع ہم جناب ٹامسن صاحب بہادر کو گذشتہ موسم سرما میں دے چکے ہیں ، اور انھوں نے بخوشی پیٹرن ہونا منظور کر لیا ہے ۔ اور اب ان کی عدم موجودگی میں جناب آس بورن صاحب بہادر قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہماری کمیٹی کے پیٹرن ہیں ۔ اس کے سوا تحصیل‌دار صاحب اور آٹھ ممبر میونسپل کمیٹی کے ہماری کمیٹی کے بھی ممبر ہیں ، اور ہیڈ ماسٹر صاحب بورڈ اسکول ، جو کہ ایک معزز عہدہ دار سرکاری ہیں اور سکریٹری میونسپل کمیٹی دونوں ہماری کمیٹی میں سکریٹری شپ کا کام انجام دیتے ہیں ۔ مذکورہ بالا تمام عہدے دار اور شہر کا ہر فرد بشر جس نے میموریل فنڈ میں کم یا زیادہ چندہ دیا ہے ، ہر وقت اختیار رکھتا ہے کہ لائبریری کے انتظام کو آ کر دیکھے ، اس کے رجسٹروں کو ملاحظہ کرے ، جو غلطی ہو اس کی اصلاح کرے اور جو بات لائبریری کے حق میں مفید ہو اس کے لیے سکریٹری یا محرر کو ہدایت دے ۔ اس سے زیادہ لائبریری کی طرف سے صاحب

ڈپٹی کمشنر بہادر اور نیز پبلک کا اور کیا اطمینان ہو سکتا ہے ۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ لائبریری کا انتظام ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے ، اس کے قواعد بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوئے ، مگر زیادہ تر اس کا سبب یہ ہے کہ سکریٹری ایک نہایت ضروری کام کے لیے چھ مہینے تک لائبریری سے غیرحاضر رہا اور اس کی عدم موجودگی میں بہت سے کام بند رہے ، یہاں تک کہ کتابوں کی خریداری بالکل موقوف ہو گئی ، مگر اب امید ہے کہ قواعد بھی مکمل ہو جائیں گے اور کتابوں کی خریداری بھی جاری ہو جائے گی ۔

۱۰

تقریر صدارت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ کراچی

(خطباتِ عالیہ، حصہ دوم، صفحہ ۲۶ تا ۵۳)

سرسید نے ۱۸۸۶ع میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو سلجھانے اور مسلمانوں کو حصول علم کی ترغیب دلانے کے لیے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کے ساتھ ایک انجمن قائم کی جس کا نام شروع میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا۔ چوں کہ کانگریس کے نام سے اشتباہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی ہندوؤں کی آل انڈیا کانگریس کی طرح کی کوئی مجلس بنائی گئی ہے لہٰذا سرسید نے اس کا نام بدل کر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس رکھ دیا۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی بننے پر محمڈن کا لفظ اس کے نام سے نکال کر 'مسلم' کا لفظ داخل کر دیا گیا۔ چناں چہ آج تک اس مجلس کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 'سلطان جہاں منزل' اس کا عظیم الشان دفتر ہے۔

سرسید کے زمانے میں بھی اور اُن کے بعد بھی اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتے رہے۔ چناں چہ ۱۸۸۸ع اور ۱۸۹۸ع کے اجلاس لاہور میں منعقد ہوئے۔ ہر اجلاس کا صدر ملک کا کوئی بڑا لیڈر یا رہنما یا کوئی با اثر اور صاحبِ دولت شخص ہوتا تھا، جو بڑی قابلیت سے اپنا صدارتی خطبہ تیار کرکے لاتا اور کانفرنس میں پڑھا کرتا تھا۔ کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ۱۹۰۷ع میں بمقام کراچی منعقد ہوا اور اُس کے صدر حضرت شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی قرار پائے۔ اگرچہ سفر لمبا تھا اور مولانا حالی بیمار اور کمزور تھے مگر اُنھوں نے ان موانعات کے باوجود نواب وقار الملک سکریٹری علی گڑھ کالج کے اصرار پر صدارت منظور فرما لی اور کراچی تشریف لے گئے۔ اس موقع پر حضرت مولانا نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۸۸۶ع سے لے کر ۱۹۲۷ع تک ایجوکیشنل کانفرنس کے چالیس اجلاس ہوئے اور چالیس ہی خطبے صدارت کے پڑھے گئے۔ ان تمام خطبوں کو ۱۹۲۷ع میں نواب صدر یار جنگ مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ہدایت کے بہ موجب مولوی انوار احمد زبیری مارہروی نے مرتب کیا اور 'خطبات عالیہ' کے نام سے اُنھیں تین جلدوں میں علی گڑھ سے شائع کر دیا۔ ان میں دوسری جلد کا پہلا خطبہ وہی ہے جو یہاں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تقریر رپورٹ

کانفرنس بابت اجلاس بست و یکم میں ، اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۳ جنوری ۱۹۰۸ع کے پرچے میں بھی چھپ چکی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

حضرات ! جو عزت کہ آج مجھ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی گئی ہے ، جہاں تک غور کیا جاتا ہے ، اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا خیال میں نہیں آتی کہ چوں کہ سندھ میں انگریزی تعلیم گویا بالکل مفقود ہے ، اس لیے شاید یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس موقع پر صدر انجمن ایک ایسے شخص کو بنایا جائے ، جو انگریزی کا ایک حرف نہ جانتا ہو ، ورنہ میں اپنے تئیں ہرگز اس جلیل القدر منصب کے لائق نہیں سمجھتا ۔ لیکن ہر حال میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں ۔ اس کے بعد میں نہایت ادب سے تمام حاضرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان خدمت کے ادا کرنے میں میری کم‌لیاقتی کے سبب جو فروگذاشت یا کوتاہی ظہور میں آئے ، اس سے در گذر فرمائی جائے ، اور آج کی صدارت کو ان عالی درجہ اور عالی مقام بزرگوں کی صدارت کے پیمانے سے نہ جانچا جائے جو گذشتہ اجلاسوں میں اس معزز کرسی پر جلوس فرما چکے ہیں ۔

صاحبو ! پہلے اس سے کہ کانفرنس کے اصلی مقصد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے ، میں چند الفاظ اس درد ناک واقعے کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے نہ صرف ہماری قوم کو بلکہ خاص کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے ؛ آپ کو معلوم ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۸۶ع میں بعد قیام مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے اس کانفرنس کی بنیاد اس لیے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعے سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی منادی کی جائے ۔ چناں چہ اس قوم کے فدائی نے باوجود کبر سن اور طرح طرح کے موانع اور معذوریوں کے ، جس طرح اول کالج کے لیے لمبے لمبے سفر کیے ، اسی طرح ملک کے مختلف مقامات میں خود پہنچ کر اجلاس منعقد کرائے اور ایک حد تک تعلیم کی منادی اطراف و جوانب میں کرکے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا ۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی میں کانفرنس کا دورہ صرف پنجاب اور ممالک متحدہ کے چند خاص خاص شہروں میں محدود رہا ۔ مگر ان کی وفات کے بعد جب کہ تمام قوم پر مایوسی چھائی ہوئی تھی ، اور کالج اور کانفرنس بلکہ تمام قومی کاموں کی طرف سے مختلف قسم کے تردد آمیز خیالات دلوں میں موج زن تھے ، خداے تعالی نے اپنی رحمت کاملہ سے قوم کی کشتی‌بانی کے لیے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے کالج اور کانفرنس دونوں کے حق میں فی‌الحقیقت مسیحائی کا کام دیا ، اور قوم کے مردہ اور افسردہ دلوں میں از سر نو جان ڈال دی ، اور پانسو برس کے بعد لسان الغیب کی یہ بشارت پوری ہوئی کہ :

فیض روح القدس از باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می‌کرد

آپ سب صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس قوم کے مسیحا سے میری کیا مراد ہے ۔ خداے تعالی نواب محسن الملک کو اعلی علیین میں جگہ دے ۔ انھوں نے کالج اور کانفرنس کو سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صرف اپنی قدیم حالت ہی پر قائم نہیں رکھا بلکہ چند سال کے عرصے میں دونوں کی بالکل کایا پلٹ دی اور ان کو اس درجے تک پہنچا دیا ، جو امید و توقع اور وہم و گمان سے بالاتر تھا ۔ نواب محسن الملک کے عہد میں جو غیر مترقبہ ترقیات

کالج کو نصیب ہوئیں ، اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے جس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے ۔ مگر جو وسعت اور عام قبولیت کانفرنس کو اُن کی بدولت حاصل ہوئی ، وہ بھی ایک کارنامہ ہے جو مسلمانوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ ہندوستان کا کوئی حصہ (الاماشاء اللہ) ایسا باقی نہیں رہا جہاں اس جواں مرد کہن سال کی کوشش اور حسن تدبیر سے کانفرنس کا قدم نہیں پہنچا ۔ کلکتہ ، مدراس ، بمبئی اور ڈھاکا جیسے دور دست مقامات میں پہنچ کر اُس نے کانفرنس کے اجلاس نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیے ۔ اور مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے عالی ہمتی اور جفاکشی کی ایک مثال قائم کر دی ۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
غل علم کا برہما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی
وہاں آب حیات ان کو پلایا جا کر

افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہے ۔ مگر اُس کی جدائی کا داغ بطور قائم مقام کے ہمارے دل میں موجود ہے اور اُس کی یاد نشتر کی طرح ہمارے سینے میں کھٹک رہی ہے ۔ کئی سال سے نواب محسن الملک کی صحت نہایت نازک چلی آتی تھی اور نہایت شدید امراض نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا ۔ مگر وہ ہر حالت میں برابر قوم کی خدمت کرتے رہے اور بیماریوں سے ہمیشہ لڑتے رہے ، یہاں تک کہ اُن کا وقت آ پہنچا اور قوم اُن کی جلیل القدر خدمات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آ گیا آخر
یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار
سر کرکے مہم قوم کی کام آ گیا آخر
سیّد کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہنا تھا ز بس قوم کی تقدیر میں بے کس
لکھا ہوا تقدیر کا پیش آ گیا آخر
نکبت کا پتا ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدّر
نکبت کا مقدّر کو پتا پا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا
پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے
وہ خون کے آنسو اُنھیں رلوا گیا آخر
یوں جیتے ہیں ، یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

صاحبو ! فی الواقعہ نواب محسن الملک کا اس وقت دنیا سے اُٹھ جانا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے عموماً اور اس کانفرنس کے لیے خصوصاً ایک ایسا صدمہ تھا کہ اگر خدا کی مہربانی ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی تو اُس کی تلافی امکان سے خارج تھی ۔ مگر میں تمام ممبران کانفرنس کو مبارک باد دیتا ہوں کہ قوم نے بالاتفاق نواب مرحوم کا جانشین ایک ایسے معزز و محترم شخص کو منتخب کیا ہے جس کی ذات سے مرحوم کے بعد مسلمانوں کو وہی امیدیں ہیں جو سرسید کے بعد نواب محسن الملک کی ذات سے تھیں ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کے تمام اسلامی اخبار ، تمام اسلامی

انجمنیں اور تمام ٹرسٹیان محمڈن کالج بغیر کسی استثنا کے اس بات پر متفق ہو گئے کہ بجائے نواب مرحوم کے محمڈن کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری سیکرٹری نواب وقارالملک بہادر انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب کو بنایا جائے ۔ اور یہ اتفاق اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ انتخاب قوم کے حق میں ، کالج کے حق میں اور اس کانفرنس کے حق میں خدا کی رحمت ثابت ہوگا ۔ کیوں کہ مخبر صادق علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ”مارأہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن . . . “ یعنی جس بات کو تمام مسلمان بہتر سمجھیں ، وہی خدا کے نزدیک بھی بہتر ہے ۔ نواب محسن الملک کی وفات اور اُن کے بعد نواب وقار الملک کی جانشینی پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے :

عید رمضاں آمد و ماہ رمضاں رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

صاحبو ! اس ناگزیر تمہید کے بعد میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں ؛ واضح ہو کہ آج کا اجلاس جو ملک سندھ کے اس مشہور بندرگاہ میں منعقد ہوا ہے ، ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ہے ، لیکن جو خصوصیت کہ ملک سندھ کو اسلام کے ساتھ ہے اس کے لحاظ سے یہ ملک اس بات کا مستحق تھا کہ اہل اسلام کی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس اس ملک میں ہوتا ۔ عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آتا ہے ، ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کا نام نہیں آتا ، کیوں کہ ہندوستان میں جس حصے سے عرب کو سب سے پہلے واقفیت ہوئی وہ یہی ملک سندھ تھا ۔ یہی وہ خطہ ہے جس کو سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے پہلی صدی ہجری کے اخیر میں فتح کرکے یہاں بنی آمیہ کی سلطنت کا جھنڈا گاڑا اور گویا کہ مسلمان کشور کشاؤں کے لیے ہندوستان کی آئندہ فتوحات کا

دروازہ کھول دیا ۔ یہی ملک ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس قائم ہوئے اور فتح کے بعد ایک صدی میں تمام خطہ محدثین و فقہا کی کثرت سے عراق و شام کا نمونہ بن گیا ۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کو عرب اپنے اصلی وطن سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے تھے ۔ محمد بن قاسم کے حسنِ انتظام اور عمدگیِ قوانین کی وجہ سے یہ ملک نہ صرف ریگستان ہونے کے لحاظ سے بلکہ دین و مذہب ، مذاق و عادت اور اوضاع و اطوار کی حیثیت سے بھی سرزمینِ عرب کی سچی تصویر بن گیا تھا ۔ اور جیسا کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے ، اس نوجوان فاتح کی چند روز کی حکم رانی نے جو گہرا اور پائدار نقش اہل سندھ کے دلوں پر جما دیا تھا ، ایسا نقش پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی نہیں جما سکیں ۔ مگر افسوس ہے کہ جو حال ہندوستان کے عام مسلمانوں کی غفلت اور بے پروایی کا زمانۂ حال کی تعلیم کی طرف سے دیکھا جاتا ہے ، ویسا ہی بلکہ اُس سے بہت زیادہ سندھ کے مسلمانوں کا حال نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے قیام کانفرنس سے لے کر اب تک ، جس کو بیس اکیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے ، کوئی تحریک ملک سندھ کی طرف سے کانفرنس کے مدعو کرنے کے لیے نہیں ہوئی ۔ سب سے پہلے سال گذشتہ میں آنریبل سردار محمد یعقوب خاں مرحوم نے اس باب میں سلسلہ جنبانی کی تھی اور ایک مختصر رپورٹ مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کے متعلق قلم بند کرکے آنریری سیکرٹری کانفرنس کے پاس بھیجی تھی ، مگر افسوس ہے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنی زندگی میں کانفرنس کو یہاں نہ بلا سکے ۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے معزز جانشین جناب آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی وزیر حال ریاست خیرپور سندھ نے اس منصوبے کو ، جو سردار صاحب مرحوم

نے باندھا تھا ، بہ سرپرستی ہزہائنس میر صاحب خیرپور سندھ بوجہِ احسن پورا کیا ہے ، جس کا نتیجہ اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔

حضرات ! اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطلاع کے لیے سردار صاحب مرحوم کی مذکورۂ بالا رپورٹ اور نیز بعض دیگر بہی خواہان قوم کے بیان کا خلاصہ نہایت مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کروں ، جس سے آپ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی یاتنزل کا کسی قدر اندازہ کر سکیں ۔ مذکورہ بالا ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے بہت زیادہ ہے ۔ یعنی منجملہ ۳۲ لاکھ دس ہزار نو سو دس نفوس کے ، جوکہ سندھ میں آباد ہیں ، ۲۴ لاکھ ۴۶ ہزار ۴ سو ۸۹ یعنی تین چوتھائی سے زیادہ مسلمان ہیں ۔ ۱۸۴۳ع میں ، جب کہ یہ ملک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آیا ، اُس وقت گیارہ سو برس سے زیادہ زمانہ اُس کو مسلمانوں کے تحت حکومت رہتے گذر چکا تھا ۔ اب بھی تمام کاشت کار اور تمام جاگیردار مسلمان ہیں اور انگریزی عمل داری سے پہلے تمام اراضی کے مالک مسلمان تھے ۔ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہ تھی ۔ البتہ اب مہاجنوں اور دیگر اقوام نے مختلف طریقوں سے زمین کا بہت سا حصہ حاصل کر لیا ہے ۔ لیکن اب بھی زمین داری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں ہی کے قبضے میں ہے ، یعنی تین چوتھائی سے زیادہ زمین مزروعہ مسلمانوں کی ملکیت میں ہے ۔ مگر باوجود ان تمام فوقیتوں کے ، جو سندھ کے مسلمانوں کو اب تک حاصل ہیں ، جب ان کا حال اس معیار سے دیکھا جاتا ہے جو آج کل قوموں کی پستی اور عروج کا معیار ہے ، تو نہایت مایوسی ہوتی ہے ۔ تعلیم ، تجارت ، صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمت ، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کی

ترقی یا تنزل کی خبر دیتی ہیں ۔ مگر سندھ کے عام مسلمان ان میں سے ہر ایک حیثیت کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں ۔ اگرچہ اہل اسلام کی حالت تعلیم کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں بہ مقابلہ دیگر ابنائے وطن کے عموماً قابل افسوس ہے ، مگر سردار صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ کسی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر ابتر نہ ہو گی ، جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ہے ۔ بی ۔ اے پاس مسلمانوں کی تعداد اُنھوں نے بہ مقابلہ دو سو ہندو گریجویٹس کے تمام سندھ میں صرف دس لکھی ہے ۔ مگر میں نے سنا ہے کہ ان دس میں ایک آدھ کے سوا سب کراچی کے غیر سندھی باشندے ہیں جو تجارت کی غرض سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹری ، سائنس اور انجنیئرنگ میں بہ مقابلہ ۲۰ ہندوؤں کے صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے ۔ بیرسٹروں اور ایل ۔ ایل ۔ بی پلیڈر اس صوبے میں دو سو سے زائد ہیں جن میں مسلمان صرف بیس ہیں ۔ اور منجملہ ایک سو بیس طلبہ کے جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے ، صرف ۱۲ مسلمان تھے ۔ مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم ہی کی کمی نہیں ہے ، بلکہ عربی فارسی ، یہاں تک کہ سندھی زبان میں بھی اُن کی تعلیم کا تقریباً ایسا ہی حال ہے ۔ فی صدی ایک دو سے زیادہ نوشت و خواند نہیں کر سکتے ۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں نہ صرف انگریزی تعلیم کی ترقی ہے بلکہ فارسی تعلیم بھی قدیم زمانے سے اُن میں چلی آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سرکاری گویا ہندوؤں کا حصہ ہو گئی ہے ۔ سردار صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے سبب اُن کے ہاتھ سے ہر قسم کی سرکاری نوکریاں نکل گئی ہیں اور یہی حال پیشہ اور صنعت و حرفت کا ہے ۔ سندھ میں ایک

ہندو صاحب ششن جج اور ایک اسسٹنٹ جج ہیں ، مگر اس درجے کا کوئی عہدہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔ بیس سب ججوں میں صرف ایک شخص مسلمان ہے اور محکمۂ مال میں منجملہ بیس ڈپٹی کلکٹروں کے صرف تین مسلمان ہیں اور باقی سب ہندو ۔ اور منجملہ ۷۲ تحصیل داروں کے صرف ۲۲ مسلمان اور باقی سب ہندو ہیں ۔

۱۹۰۵—۶ع میں صیغۂ اصلاح تمدن کے کسی ممبر نے دو مضمون سندھ کی تمدنی اور تعلیمی حالت پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے تھے جن میں ثابت کیا تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کی تمدنی اور تعلیمی حالت ہندوستان کے تمام صوبوں سے گئی گزری ہے ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ زمانہ آہستہ آہستہ اہل سندھ کو ترقی کی طرف مائل کرتا جاتا ہے ۔ اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا احساس ہونے لگا ہے ۔ گورنمنٹ بھی اُن کے معروضات پر زیادہ توجہ اور اُن کے حقوق پر زیادہ لحاظ فرمانے لگی ہے ۔ کراچی کا اسلامی مدرسہ جو مرحوم خان بہادر حسن علی صاحب کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے ، ترقی کرتا جاتا ہے ۔ خصوصاً جب سے کہ مسٹر وائنس اس مدرسے کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں ، اُس کے نتائجِ خاطر خواہ ظہور میں آ رہے ہیں ۔ لڑکانہ میں وہاں کے زمین داروں کی کوشش اور مسٹر پٹر آئی ۔ سی ۔ ایس کلکٹر لڑکانہ کی خاص توجہ سے ایک مدرسہ جس میں انگریزی کی پانچویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے ، قائم ہو گیا ہے جس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی ہے ۔ ۱۹۰۲ع میں جو مسٹر علی محمد خاں دہلوی بیرسٹر ایٹ لا کی کوشش سے لوکل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا تھا ، اُس کے نتائجِ خاطر خواہ ظہور میں آئے ہیں ۔ گورنمنٹ نے کانفرنس کی کارروائی پر نہایت شفقت آمیز رزولیوشن پاس کیا اور ایک کمیٹی موسوم بہ محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی مقرر فرمائی جس کی تجویز سے ایک چھوٹا سا

رزیڈنشل مدرسہ ضلع حیدر آباد کے شمال میں کھولا گیا ، اور جیسا کہ سردار صاحب مرحوم کی رپورٹ میں درج ہے ، دوسرا مدرسہ ضلع حیدر آباد کے جنوب میں کھلنے والا تھا اور تیسرا کلرک آباد میں اور چوتھا ان سب مدرسوں کی نسبت بڑے پیمانے پر ضلع ٹھار اور پارگڑھ کے مقام بتھار میں ، جس کی عمارت تیار ہو چکی ہے ، جاری ہونے والا ہے ۔ پانچواں سکھر میں کھولا جانا تجویز ہوا ہے جس کا کچھ سرمایہ جمع بھی ہو گیا ہے اور جس کی عمارت کے واسطے زمین لے لی گئی ہے ۔ اسی طرح سندھ کے کل اضلاع میں ایک ایک مدرسہ جاری کرنے کا سامان ہو چکا ہے ، اور خاص کر حیدر آباد میں دو مدرسے قائم کرنے کا ارادہ ہے ۔ مگر سردار صاحب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا مجوزہ مدارس کے لیے روپے کی بہت ضرورت ہے ۔ صرف مدرسۂ کراچی کا بورڈنگ ہاؤس بڑھانے کے لیے ، جس میں زیادہ طلبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ، پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے ، جس میں سے چھ ہزار روپیہ ریاست خیرپور نے عطا کیا ہے ، اور بیس ہزار روپیہ عام مسلمانوں کے چندے سے وصول کیا گیا ہے ۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سندھ کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کا خیال شروع ہو گیا ہے اور قدیم تعصبات جو انگریزی تعلیم سے مانع آتے تھے ، سندھ میں بھی مثل اور صوبوں کے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں ۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اور صوبوں کی طرح یہاں بھی بغیر امدادی وظائف کے مسلمانوں کا تعلیم پانا نہایت دشوار ہے ۔ جو لوگ تعلیم پانے کی استطاعت رکھتے ہیں ، وہ تعلیم سے بھاگتے ہیں اور جو تعلیم کے خواہاں ہیں وہ استطاعت نہیں رکھتے ۔ اگرچہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے گورنمنٹ اُن کی تعلیم کی طرف نہایت متوجہ پائی جاتی ہے ، اور ریاست خیرپور

سے بھی اُن کو بہت کچھ امداد کی توقع ہے ، لیکن پھر بھی سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کا پھیلنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ جس قوم کی حالت تعلیم سے اس قدر بعید ہو کہ اپنی مادری زبان میں بھی نوشت و خواند کرنے والے نہایت کم یاب ہوں ، اُن کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے ۔ جب تک قوم میں ایسے بہت سے جواں مرد صاحب استقلال اور قوم کے ہم درد پیدا نہ ہوں گے جیسے کہ مرحوم خان بہادر حسن علی بانیِ مدرسہ کراچی تھے یا جیسے مسٹر دہلوی بیرسٹر ایٹ لا اب موجود ہیں ، اُس وقت تک صرف گورنمنٹ کی توجہ اور ہزہائنس میر خیرپور سندھ کی امداد سے کام نہیں چل سکتا ۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا ، سب سے پہلے اُنھوں نے اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ مسلمان کیوں اپنی اولاد کو سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے نہیں بھیجتے ، ایک انعامی اشتہار جاری کیا تھا تاکہ بہت سے لائق آدمی اس مضمون پر اپنی اپنی رائے ظاہر کریں ۔ چناں چہ بتیس مضمون مختلف لوگوں کے اُن کے پاس پہنچے جن کا ماحصل یہ تھا کہ سرکاری طریقۂ تعلیم ، جس کو سرکار کسی خاص فرقے کی حالت کے موافق بدل نہیں سکتی ، مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے اور مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے ، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کی فکر آپ کریں ۔

صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ جو مشکلات سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کی سدراہ ہیں ، اگرچہ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو گورنمنٹ کی توجہ سے رفع ہو سکتی ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں

کہ جب تک خود قوم کے لیڈر اُن کے حل کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوں ، ہرگز رفع نہیں ہو سکتیں ۔ یہاں میں چند مشکلات کا جو معتبر ذریعوں سے مجھے معلوم ہوئی ہیں ، ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔

اولاً سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کے عام نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اب تک لوکل سس فنڈ سے ابتدائی مدارس زیادہ تر ایسے مقامات میں قائم ہوتے رہے ہیں جہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے اور مسلمان آسانی سے وہاں اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے نہیں بھیج سکتے ۔ اس کے سوا مدارس میں اُستاد اکثر ہندو ہیں جن کی نسبت یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ اُن کا برتاؤ مسلمان طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ ، جیسا کہ اُستادوں کا برتاؤ شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہیے ، نہیں ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شکایت کہاں تک صحیح ہے لیکن تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی اولاد کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اُن کے لیے زیادہ تر مسلمان اُستاد مقرر کیے جائیں ۔ دلی میں انگریزی تعلیم مدت دراز سے جاری تھی مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے وہاں کے مسلمان تعلیم سے ہمیشہ متنفر رہے حالاں کہ وہاں کے ایک مسلمان نواب نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ اہل دہلی کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کے سپرد اس لیے کیا تھا کہ اُس کے منافع سے دہلی کے طلبہ کو وظائف دیے جایا کریں ۔ باوجود اس کے کہ فنڈ سے مسلمانوں نے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا لیکن غدر کے بعد گورنمنٹ نے اس فنڈ کی آمدنی سے ایک علیحدہ مدرسہ بنام اینگلو عربک اسکول خاص مسلمانوں کے لیے قائم کر دیا ۔ اُس میں یہ شرط لگا دی کہ یہاں کل اُستاد مسلمان رکھے جائیں ۔ اس تدبیر سے چند روز میں دہلی کے مسلمان یک قلم تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے ، یہاں تک کہ ایک عرصے کے بعد مدرسہ مڈل اسکول سے ہائی اسکول بنا دیا گیا ۔ اس وقت دہلی میں جس قدر گریجویٹ ،

انڈر گریجویٹ اور انٹرنس پاس مسلمان پائے جاتے ہیں ، سب اسی مدرسے سے ابتدائی تعلیم پا کر نکلے ہوئے ہیں ۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں سب سے بڑی اور بدیہی مثال ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ ہے ، جہاں ابتدائی تعلیم زیادہ تر مسلمان اُستاد دیتے ہیں ۔ پس سب سے پہلے یہاں کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ مجوزہ مدارس جو سندھ میں ہر ایک ضلع میں قائم ہونے قرار پائے ہیں جہاں تک ممکن ہو ، وہ ایسے مقامات میں قائم کیے جائیں جہاں مسلمانوں کی اولاد آسانی سے تعلیم کے لیے جا سکے ۔ اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اُن مدرسوں میں ہندو اور مسلمان اُستاد اُسی نسبت سے مقرر کیے جائیں جس نسبت سے کہ ہندو اور مسلمان طلبہ اُن میں داخل ہوں ۔ اول اول سندھ میں مسلمان اُستاد بلاشبہ مشکل سے مل سکیں گے لیکن موجودہ حالت میں علی گڑھ کالج یا لاہور کے اسلامیہ کالج سے کسی قدر زیادہ تنخواہ پر بلائے جا سکتے ہیں ۔ جس طرح مسلمان استادوں کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے ، اُسی طرح معائنہ کرنے والے افسروں میں بھی مسلمانوں کا ہونا کچھ کم ضروری نہیں ہے ۔

دوسری مشکل جو مسلمانوں کی تعلیم میں درپیش ہے ، وہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہے اور یہ ایسی مشکل ہے جس کا حل کرنا خود ہمارے ہاتھ میں ہے ، نہ کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ۔ کیوں کہ گورنمنٹ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ، ہندوستان کی بےشمار قوموں میں سے کسی خاص قوم کی مذہبی تعلیم، یہاں تک کہ عیسائی مذہب کی تعلیم بھی اپنے مدارس میں جاری نہیں کر سکتی ۔ پس ضرور ہے کہ جو ابتدائی مدارس سندھ کے اضلاع میں قائم کیے جائیں ، اُن میں مذہبی تعلیم کا انتظام خود قوم کی طرف سے کیا جائے ۔ میں سنتا ہوں کہ سندھ میں جس طرح دنیوی

تعلیم مفقود ہے ، اسی طرح مذہبی تعلیم کی طرف سے بھی یہاں انتہا درجے کی غفلت اور بے پرواہی پائی جاتی ہے ۔ مجھ سے میرے ایک ثقہ دوست نے بیان کیا کہ سندھ میں ایک موقع پر تین نوجوان مسلمان موجود تھے ۔ میں نے اسلامی روایات سے اُن کی حد سے زیادہ ناواقفیت دیکھی ، تو امتحاناً اُن سے یہ سوال کیا کہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمھارا نبی کون ہے ؟ ایک نے کہا : ’’امام حسین‘‘ (چیرز) دوسرے نے کہا : ’’فیض محمد خاں میر خیر پور‘‘ (چیرز) اور تیسرے نے کہا : ’’پیر پگھارا‘‘ (چیرز) ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سندھ میں مذہبی تعلیم کا کیا حال ہے ۔ جو لوگ کراچی یا حیدر آباد میں رہتے ہیں ، وہ اس حکایت کو سن کر بلاشبہ تعجب کریں گے مگر جو لوگ دیہات کی حالت سے خبردار ہیں ، ان کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا ۔

تیسری مشکل اور سب سے بڑی اور سخت مشکل وظائف کے لیے سرمایہ مہیا کرنا اور قوم کے ہونہار بے استطاعت لڑکوں کو امدادی وظائف دے کر مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم کے لیے بھیجنا ہے ۔ بالفعل کراچی کا اسلامیہ اسکول اور لڑکانہ کا مدرسہ اور حیدر آباد و سکھر وغیرہ کے مجوزہ مدارس ، بشرطیکہ وہ بہمہ وجوہ مکمل ہو جائیں ، سکنڈری تعلیم تک کافی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی میں گورنمنٹ کالج موجود ہے ۔ اور اگر کافی امداد طلبہ کو دی جائے تو لاہور کے اسلامیہ کالج اور علی گڑھ کے محمڈن کالج میں بھی اُن کو بھیجا جا سکتا ہے ۔ مسلمانوں کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ اُن سے تعلیم کے لیے چندہ وصول کرنا نہایت مشکل ہے مگر تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ اگر چندہ وصول کرنے والے موجود ہوں تو چندہ دینے والوں کی کمی نہیں ہے ۔ ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ چندہ مانگنے والے جس قدر زیادہ ذی وجاہت ،

زیادہ ذی رتبہ اور زیادہ اعتبار والے ہوں گے ، اُسی قدر چندہ فراہم کرنے میں زیادہ کامیابی ہوگی ۔ پس جب تک کہ قوم کے ممتاز لوگ اس کام کے لیے کھڑے نہ ہوں گے اور جب تک کہ وہ قوم کے لیے گداگری کرنے کو بجائے ننگ و عار سمجھنے کے ذریعۂ فخر و مباہات نہ سمجھیں گے ، روپیہ تحصیل کرنا سخت مشکل ہے ۔ تعلیم روز بروز گراں ہوتی جاتی ہے اور بے مقدور لوگوں کے لیے جو سب سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہیں ، اُس کا میدان تنگ ہوتا جاتا ہے ۔ پس نہایت ضرورت اس بات کی ہے کہ یا تو ذی مقدور لوگوں میں ایسے بہت سے عالی ہمت اشخاص پیدا ہوں جو اپنی دولت کا ایک حصہ قوم کی تعلیم میں صرف کریں اور اپنی ہم وطن قوموں کے اہلِ ہمت سے سبق حاصل کریں جو لاکھوں روپیہ اور لاکھوں کی جائداد قوم کی بھلائی کے لیے وقف کر رہے ہیں ۔ یا چند جواں مرد کمر ہمت باندھ کر اور جھولی گلے میں ڈال کر کھڑے ہو جائیں اور قوم کے بچوں کے لیے گداگری اختیار کریں ۔ سرسید کی کامیابی کا بھید زیادہ‌تر اسی گداگری میں چھپا ہوا ہے ۔ ان کے ایک دوست کے پوتا پیدا ہوا تھا ، اُن سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپے طلب کیے ، جس پر اُن کے دوست نے ایک معقول رقم چراغی کے نام سے نذر کی ۔ ایک اور دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علی گڑھ میں آئے ۔ آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے ۔ وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے ۔ نمائش گاہ علی گڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کو دکان پر بیٹھے ۔ نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی ۔ چنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور خود اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں ۔ انھوں نے چندہ مانگنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں ، کس سے مانگتا ہوں اور کس طرح مانگتا ہوں ۔

صاحبو ! آپ کے سامنے اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دُنیا میں تعلیم نے کیسا انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ تعلیم‌یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ قوموں میں وہی نسبت نظر آتی ہے جو آدمی اور جانور میں ہونی چاہیے ۔ جو قومیں غفلت یا تعصب سے ابتدا میں مغربی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں وہ اپنی نادانی پر کفِ افسوس ملتی ہیں اور گو ترقی کا موقع اُن کے ہاتھ سے اب بہت دور جا پڑا ہے مگر چار و ناچار اُن کو بھی آخرکار اُسی مغربی تعلیم کے سایے میں پناہ لینی پڑی ہے جس کے نام سے وہ سو سو کوس دور بھاگتی تھیں ۔ خصوصاً مسلمان جو سب سے زیادہ تعلیم کے مخالف تھے ، اُن کی بھی اب بہت دیر کے بعد آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے بھی اُس مسافر کی طرح جو قافلے سے بچھڑ کر بہت پیچھے رہ گیا ہو ، نہایت پشیمانی کے ساتھ اُفتاں و خیزاں قافلے کے پیچھے دوڑنا شروع کیا ہے ۔ مصر ، ترکی ، ایران اور افغانستان میں تعلیم کا خیال روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے ۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی اپنی قومی ہستی ترقیِ تعلیم پر منحصر سمجھی ہے ۔ چناں‌چہ روس کے ذی مقدور مسلمان اپنے عطیات سے اور متوسط‌الحال لوگ قومی چندوں کے ذریعے سے اپنے ملک کے اہلِ اسلام میں تعلیم پھیلا رہے ہیں ۔ جو لیکچر روس کے مشہور اسلامی اخبار ”ترجمان“ کے ایڈیٹر نے یکم نومبر سنہ حال کو قاہرہ میں دیا تھا اُس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ”اخیر چوتھائی صدی میں روس کے مسلمانوں میں ترقی کے خیالات کثرت سے پھیلنے لگے ہیں ۔ انھی خیالات کا اثر ہے کہ اخیر زمانے میں اُن کی توجہ مدارس کی اصلاح پر مائل ہوئی ہے اور وہ مفید کتابیں علوم جدیدہ اور ترکی لٹریچر کی شائع کرنے لگے ہیں اور جدید طرز کے مدارس کھولتے جاتے ہیں اور انھوں نے

علوم جدیدہ اور علوم عربیہ و ادبیہ کی تحصیل کے لیے اپنے اپنے طلبہ کو روس کے مدارسِ عالیہ اور یورپ، ٹرکی اور مصر کے مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا ہے ۔ ابتدائی اسلامی مدارس جن کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہو گئی ہے، تعداد میں ایک ہزار کے قریب ہیں ۔ مذہبی مدارس میں سے جن کی اصلاح ہو چکی ہے، ایک مدرسہ کازان میں، ایک اورن برگ میں اور ایک اوفا میں ہے ۔ ان مدرسوں میں ریاضیات، طبیعیات، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے اور علومِ عربیہ اور علوم دینیہ کی کتابیں بھی حسب معمول پڑھائی جاتی ہیں ۔“

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ ”حسن اتفاق سے روسی مسلمانوں میں ایسے فیاض دولت مند پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنی دولت علم کی اشاعت اور قوم کی اصلاح و ترقی میں بے دریغ صرف کی ۔ اُن میں سے خاص کر ذکر کرنے کے لائق مرحوم حاجی نعمت اللہ فرامیشف ہیں جنھوں نے ایک سو مدرسوں اور ایک سو مسجدوں کی اپنے روپے سے بنیاد ڈالی اور ایک عالی شان کتب خانہ قائم کیا جس میں نہایت عمدہ اور نادر کتابیں جمع کی گئیں ہیں ۔ کازان کے نام ور مسلمان تاجر مرحوم احمد حسینی نے بھی مدرسوں کی بنیاد ڈالنے اور علومِ جدیدہ کے پھیلانے میں تین لاکھ روبل (یعنی سات لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ) صرف کیا ۔ مرحوم احمد حسینی کے بھائی عبدالغنی حسینی نے بھی دو سو ابتدائی اسکول نئے طریقۂ تعلیم کے قائم کیے اور اسکولوں کی اصلاح کے خیالات کو انھوں نے روس کے اندرونی صوبوں ہی میں نہیں بلکہ اُن دور و دراز صوبوں میں بھی پھیلایا ہے جو چین کی آسانی سلطنت کی حدود پر واقع ہیں ۔“

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ”منجملہ ان فیاض دولت مند مسلمانوں کے ایک حاجی زین العابدین ناقیف ہیں جو باکو کے رہنے والے ہیں ۔ انھوں نے علم کو پھیلانے اور محتاج اور غریب مسلمانوں

کی امداد کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کی ہے ۔ اس فیاض شخص نے داغستان میں ایک سو مسجدیں اور ایک سو ابتدائی مدرسے قائم کیے ۔ باکو کے نواح میں عام زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق ایک وسیع خطۂ زمین بطور نمونے کے مخصوص کیا تاکہ جدید طریقۂ کاشت کاری کو مسلمان سیکھیں اور اس کی تقلید کریں ۔ روسی زبان اور ترکی زبان میں کئی اخبار شائع کرائے جن سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ روس کے حقوق کی حفاظت کی جائے، اور مسلمانوں کے ملکی اور سیاسی خیالات کا اُن کے ذریعے سے اظہار کیا جائے ۔ اس کے سوا انھوں نے لاکھوں روپیہ یورپ اور روس کی یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو تعلیم دلانے میں صرف کیا ۔ روس میں جو آج کل نامور مسلمان ڈاکٹر، وکیل اور انجینیر ہیں وہ سب اس فیاض دولت مند مسلمان کے شرمندۂ احسان ہیں ۔ انھوں نے مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا ۔ چناں چہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جس عالی شان مدرسے کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے، صرف اس کی تعمیر پر تین لاکھ روپے یا بیس ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے ۔ اسی مدرسے کے اخراجات کے لیے انھوں نے ایک جائداد وقف کر دی ہے جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار پونڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپیہ ہے ۔“

اس کے بعد انھوں نے مسلمانانِ مصر کو مخاطب کر کے کہا کہ اے معزز محترم مسلمانانِ مصر! آپ لوگ ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ خداوند عالم اس فیاض ہمدرد قوم کو مدت دراز تک زندہ سلامت رکھے ۔ پھر کہا ”ایسے مسلمان دولت مند جنھوں نے ایک یا دو ابتدائی یا متوسط درجے کے مدرسے روس میں قائم کیے اُن کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ میں اُن کا کوئی شمار نہیں بتا سکتا ۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہم روس کے مسلمانوں نے ترقی کے میدان میں جو قدم بڑھایا ہے، وہ انھی مدرسوں کی

بدولت ہے''۔

صاحبو! اس فاضل لیکچرار کے بیان میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ آس نے اپنے طول طویل لیکچر میں، جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے گئے ہیں، کہیں ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے پایا جائے کہ روس کے مسلمانوں کے ان پرائیویٹ اسکولوں میں گورنمنٹ روس نے بھی کچھ امداد دی ہے یا نہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے صاف صاف اس بات کا اظہار کیا ہے کہ روس کے مسلمانوں نے جو کچھ تعلیم میں اب تک ترقی کی ہے، وہ محض اپنی قوم کی امداد سے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کا حال اس باب میں گورنمنٹ روس کی رعایا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں گورنمنٹ آن قوموں کو جو تعلیم میں اپنے دیگر ہم وطنوں سے نہایت پست حالت میں ہیں، طرح طرح سے تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے آن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرتی ہے اور آن کے پرائیویٹ اسکولوں میں امداد دیتی ہے۔ اور اگر ان کی کوشش سے کوئی بڑا قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہوتا ہے تو آس کی خود سرپرست بنتی ہے۔ پس ہم مسلمانوں کو بہ مقابلہ روس کے مسلمانوں کے تعلیم میں ترقی کرنا نہایت آسان ہے، بشرطیکہ ہم اپنی تعلیم کا دار و مدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہ رکھیں، بلکہ گورنمنٹ کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کے بوجھ سے سبک دوش کرتے جائیں۔ گورنمنٹ کا کام صرف اس قدر ہے کہ رعایا میں تعلیم کا مذاق اور آس کی ضرورت کا احساس پیدا کر دے۔ اس کے بعد یہ کام خود رعایا کا ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے اور جو پود گورنمنٹ نے اپنے پُر زور ہاتھ سے لگا دی ہے، آس کو اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے پروان چڑھائے اور ملک اور قوم کو آس سے فائدہ پہنچائے۔

صاحبو! سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔

آج کل تمام ترقیات کا مدار محض تعلیم پر ہے۔ جب سندھ میں تعلیم ہی نہیں تو جاننا چاہیے کہ کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ زمین داری پر نازاں ہیں، اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو زمین داری کوئی دن کی مہمان ہے، کیوں کہ جو لوگ ملک میں تعلیم یافتہ ہیں، وہ رفتہ رفتہ آن کی زمینوں پر قابض ہوتے جاتے ہیں۔ اور جس طرح سرکاری ملازمت سے مسلمان خارج ہو گئے ہیں، اسی طرح زمین داری سے بھی آخرکار آن کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ جس طرح بدنِ انسان میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، اسی طرح تعلیم کی کمی تمام قومی مصائب کی جڑ ہے۔ بغیر تعلیم کے اب دنیا میں عزت سے رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس وقت دور دور سے مسلمان اسی غرض سے کراچی میں آئے ہوئے ہیں کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ہزہائنس میر صاحب خیرپور اور آن کے روشن ضمیر وزیر نے ان کو اسی لیے مدعو کیا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کریں اور ایسی تجویزیں پیش کریں جن سے آن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا ہوں۔ سرکاری افسر تہ دل سے ترقیِ تعلیمِ مسلمانانِ سندھ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر جائلز ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند، جو پہلے ایک مدت تک اس صوبے میں ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم رہ چکے ہیں، وہ بھی عنقریب تشریف لانے والے ہیں اور امید ہے کہ اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو عزت بخشیں گے۔ اب وقت ہے کہ سندھ کے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں اور آن کی ترغیب کے جو اسباب اس وقت جمع ہو گئے ہیں، آن کو غنیمت سمجھیں اور آن سے فائدہ اٹھائیں۔

زمانہ دیر سے چلاّ رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز، پہچانو

سنا تم نے نہ ہو قول نبی گر شان میں میری
تو اب سن لو کہ ہوں میں شان ربانی مجھے مانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچتاؤ گے نادانو !
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو !
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو !
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو !
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے
ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو !
نصیحت میری مانو ، اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون ، تم بھی پھر جاؤ
گیا دورہ حکومت کا ، بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے ، رہے معلوم یہ ان کو
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت
جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصّادی ، نہ جرّاحی ، نہ کحّالی ، نہ عطّاری

جہاں تک دیکھیے ، تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے
گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا اک زیور
ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر اور نہ آہن گر ، نہ بازی گر ، نہ سوداگر
مہندس چاہیے مزدور اب اور راج اقلیدس
بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آ کر
زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے ، نام اُن کا مٹا دوں گا

صاحبو ! یہاں تک جو کچھ آپ کے سامنے بیان کیا گیا ، وہ خاص کر سندھ کی موجودہ تعلیمی حالت سے علاقہ رکھتا تھا ۔ اب میں چند الفاظ عام مسلمانان ہند کی تعلیم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں ، اگرچہ اس کے متعلق پہلے اس قدر کہا جا چکا ہے کہ میں کوئی بات اس سے زیادہ نہیں بیان کر سکتا ۔

سرسید مرحوم جنھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد ڈالی ہے ، ابتدا سے اُن کا خیال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت یہ تھا کہ جب وہ تعلیم پا کر کالجوں سے نکلیں گے ، تو ان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ جو ذریعۂ معاش وہ اپنی طبیعت کے

مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے ، اس کو خود اختیار کر لیں گے ، کیوں کہ تعلیم اُن کی خود رہ نمائی کرے گی اور اُن کو اُسی رستے پر ڈال دے گی جس کی قابلیت اُن کی فطرت میں موجود ہوگی ۔ پس یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کے سوا اُن کو کسی خاص پیشے یا صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جہاں تک دیکھا جاتا ہے ، اب تک اس خیال کا ظہور نہیں ہوا اور جو امیدیں اُن سے کی گئی تھیں ، وہ پوری نہیں ہوئیں ۔ تعلیم کے زمانے میں ہر مسلمان نوجوان محض سرکاری یا غیرسرکاری ملازمت ہی کو اپنی منزل مقصود جانتا ہے اور تعلیم کے بعد اسی کی تلاش میں دائیں بائیں ہاتھ مارتا پھرتا ہے ۔ اور اگر حسب دل خواہ اُس کو ملازمت نہیں ملتی تو یہ خیال کرتا ہے کہ تعلیم میں جو کوشش اور محنت کی گئی تھی ، وہ سب رائگاں گئی ۔ ڈاکٹری یا انجینئری بھی وہ ملازمت کی غرض سے سیکھتا ہے ۔ صرف قانون ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے معدودے چند مسلمان ، جب تک کہ اُن کو کوئی سرکاری عہدہ نہیں ملتا ، البتہ کسی قدر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں ۔ اس کے سوا کسی آزاد پیشے کے اختیار کرنے کی اُن میں جرأت نہیں پائی جاتی ۔

سرسید مرحوم نے اپنے خیال کی تائید میں ایک موقع پر یہ حکایت لکھی ہے کہ ”ایک دہقان کے بیٹے نے بہت اضطراب کے ساتھ اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے ، جب تالاب بھر جائے گا تو پانی کہاں جائے گا ۔ اُس کے باپ نے کہا : ”بیٹا اندیشہ مت کر ۔ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکاس کا رستہ آپ نکال لے گا ۔“ اس حکایت کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”یہی حال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوان کا ہے ۔ ابھی اُن کی

ایسی قلت ہے کہ وہ کوئی رستہ آئندہ زندگی کے لیے نہیں نکال سکتے ۔ جب وہ کثرت سے ہوں گے تو کوئی رستہ نکال لیں گے ۔ رستوں کی کمی نہیں ہے ، مگر ابھی تالاب بھرا نہیں ہے ۔ لیکن اے صاحبو ! جس رفتار سے مسلمانوں میں تعلیم چل رہی ہے ، اُس رفتار سے تالاب کے بھرنے میں بہت دیر معلوم ہوتی ہے ، مگر رستہ نکالنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ اور اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو تالاب کے بھر جانے کے بعد بھی خاص کر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ملازمت کے سوا کوئی دوسرا رستہ آئندہ زندگی کے لیے نکال سکیں ۔ ہندوستان کے اس خاص حصے میں جس میں کہ لکھنؤ ، آگرہ ، دہلی اور لاہور کے قدیم دارالحکومت شامل ہیں ، زیادہ تر عرب ، ایران اور ترکستان وغیرہ کی نسلیں آباد ہیں ، جن کے آبا و اجداد ہمیشہ یا تو خدمات سلطانی پر مامور رہے یا معافیات و جاگیرات کے بھروسے پر اُن کو کسی قسم کے آزاد پیشے کی ضرورت نہیں ہوئی ۔ یہاں تک کہ قانون وراثت طبیعی کے موافق رفتہ رفتہ تجارت اور صنعت وغیرہ کی قابلیت اُن کی نسلوں میں بالکل مفقود ہو گئی اور آزاد پیشوں کی جرأت کرنے کا ان میں بالکل حوصلہ باقی نہیں رہا ۔ اُن کی یہ خاصیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ نہ تعلیم سے اُن میں حس و حرکت پیدا ہوتی ہے ، نہ اپنی ہم وطن قوموں کی کاروباری زندگی دیکھ کر اُن کی ریس کرنے کا خیال اُن میں پیدا ہوتا ہے اور نہ یورپ کی عالم گیر تجارت و صنعت کا سیلاب اُن کی آنکھیں کھولتا ہے ۔ اول اول جو مسلمان شرفا دست کاری یا دکان داری کو اپنی شان کے خلاف جانتے تھے ، وہ خیال بھی روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے ۔ لیکن اُن کی جھجک جو آزاد پیشوں کی طرف سے اُن کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے ، وہ کسی طرح نہیں جاتی ۔ بعض تعلیم یافتہ نوجوان جو بڑی جرأت کرکے کوئی

کام شروع کرتے ہیں ، تو اکثر بہ سبب نا تجربہ کاری اور عدمِ واقفیت کے اُس میں کامیاب نہیں ہوتے اور آخرکار کسی قدر نقصان اٹھا کر اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں ، اور جب اُس کے دیگر ہم چشم جو کاروباری دنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے ، اپنی آنکھ سے اُن کی ناکامی دیکھتے ہیں تو اُن کے حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں اور اُن کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اور وہی غلامی یعنی ملازمت کا طوق گلے میں ڈالنا پڑتا ہے ۔

یہ حالت تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی نہایت مایوس کرنے والی اور تعلیمِ اولاد سے مسلمانوں کا دل اچاٹ کرنے والی ہے ۔ اب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قدر تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے ، اُس کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ وہ تعلیم کو ایک ذریعہ حصولِ معاش کا سمجھتے ہیں ۔ لیکن جب اُن کی اولاد تعلیم پانے کے بعد معاش کی طرف سے فارغ البال نہ ہوگی ، تو سوائے اس کے کہ وہ تعلیم کا خیال چھوڑ دیں ، اُس کا اور کیا انجام ہو سکتا ہے ۔ سرکاری ملازمتیں نہایت محدود ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ پس ممکن نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لیے حسب دل خواہ سرکاری ملازمت مل سکے ۔ البتہ صنعت و حرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے ، اُسی قدر اُن کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی ۔

یورپ کے ایک روشن خیال مصنف کا قول ہے کہ جس ملک یا قوم کا دار و مدار ملازمت پر ہوتا ہے ، وہ کبھی مرفہ الحال نہیں ہو سکتی ۔ اُن کی قدرتی قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہو جاتی ہیں ، لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے ، وہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور روانی تمام ملک

پر چھا جائے گی ۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں ، وہاں تمام کوچوں اور بازاروں پر ہر وقت افسردگی اور اداسی برستی ہے ۔ لیکن جہاں صنعت و حرفت کا بازار گرم ہے ، وہاں پر ہر شخص کے چہرے پر شگفتگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں ۔

صاحبو ! صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے ۔ جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے ، ہمارے معزز ہم وطن اُس کی طرف بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں ۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے ، اُن سے نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے ۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لیے انڈسٹریل کانفرنس قائم کی گئی ہے ۔ اور صوبوں میں بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی ہے ۔ اگرچہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اُس سے بالکل الگ رہے ہیں ، اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کر سکتے ، اسی طرح صنعت و حرفت سے بھی اس وقت تک اُن کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو ۔ میں صنعت و حرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے ، اُسی کو دہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کریں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے اُن کی حیثیت کے موافق کسی قدر معقول وظیفے دیے

جایا کریں ، تو امید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیرالتعداد نوجوان پیدا ہو جائیں گے جو اپنے ہم چشموں کو آزاد پیشوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت دلا سکیں گے ۔ اور اگر قوم کے دولت مندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ وہ بی اے پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت و حرفت کی تعلیم کے لیے معقول وظیفے دے کر یورپ یا جاپان بھیجتے رہیں ، تو امید ہے کہ تھوڑے عرصے میں ہماری قوم کے دن پھر جائیں گے ۔ جس زمانے میں سرسید مرحوم نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ولایت بھیجنے کے لیے سول سروس فنڈ کے نام سے سرمایہ جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا ، وہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ لوگ قومی ہمدردی کے نام سے بالکل بے خبر تھے اور اسی لیے اس وقت سرسید کو اس منصوبے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی ۔ مگر اب ہماری قوم کے دولت مندوں میں روز بروز ایسی مثالیں قائم ہوتی جاتی ہیں کہ اگر کوئی ایسا فنڈ قائم کیا جائے جس کے ذریعے سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم کے لیے غیر ملکوں میں بھیجا جائے تو اس مقصد میں کامیابی ہونی ناممکن نہیں ہے ۔

جس طرح صنعت و حرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلنا ضروری ہے ، اسی قدر بلکہ اس سے بہت زیادہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے ۔ خصوصاً ایسے صوبے میں جیسا کہ سندھ ہے اور جہاں اسّی فی صدی کے قریب مسلمان کاشت کار اور زمیندار ہیں ، بجائے صنعت و حرفت کے زراعتی اسکولوں میں تعلیم دلانا زیادہ بہتر ہے ، تاکہ جو لوگ زراعتی اسکولوں سے تعلیم پا کر نکلیں ، وہ زراعت کے عمدہ عمدہ فارم قائم کرکے عملی طور پر اپنے بھائیوں کو دکھائیں کہ زمانۂ حال میں زراعت نے کس قدر ترقی کی ہے کہ جس زمین سے قدیم طریقے کے موافق مثلاً پانچ روپیہ بیگھہ منافع ہو سکتا تھا ، اب نئے طریقے سے کم و بیش دس روپے منافع بہ آسانی ہو سکتا ہے ۔

بہرحال مسلمانوں کی ترقی کے لیے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے ، بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبے میں دست گاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں اُن کے ہم وطن اُن سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں ، جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں ۔ ورنہ وہ زمانہ قریب ہے کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت اور توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا ۔

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ، ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کم زور و ناتواں ہیں
سنبھلو ! وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گم نام و بے نشاں ہیں[1]

---

[1] اس مہتم بالشان اور تاریخی تقریر میں سوائے دو فارسی شعروں کے باقی سب اشعار خود مولانا حالی کے اپنے ہیں ۔ لیکن اپنی روایتی انکساری کے باعث اُنھوں نے یہاں اس کا اظہار نہیں کیا ۔ یہ سب اشعار کلیات نظم حالی میں موجود ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

۱۱

اختتامی تقریر اجلاس کراچی

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، ۱۵ جنوری ۱۹۰۸ع)

یہ وہ تقریر ہے جو کراچی کے اجلاس کو ختم کرتے ہوئے آخری دن مولانا حالی نے فرمائی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حضرت مولانا حالی اس کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ (محمد اسماعیل)

حضرات! الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس فضل الٰہی سے بخیر و خوبی اور توقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا اور اس کی طلائی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا۔ اس سال کانفرنس کے اجلاس کی طرف سے طرح طرح کے خدشے لوگوں کے دلوں میں گشت کر رہے تھے؛ اولاً نواب محسن الملک مرحوم کی وفات سے کانفرس کو سخت صدمہ پہنچتا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے کراچی کے بُعدِ مسافت کی وجہ سے بہت ہی کم ڈیلی گیٹوں کے آنے کی امید تھی۔ تیسرے ملک سندھ بہ لحاظ تعلیم کے ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں سے زیادہ پست حالت میں سمجھا جاتا تھا اور اہل سندھ کو تعلیم سے متنفر بلکہ اس کا مخالف خیال کیا جاتا تھا اور اس لیے خیال تھا کہ دیکھیے جس مقصد کے لیے اس صوبے میں کانفرنس منعقد ہوئی ہے، اس میں کہاں تک توجہ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے

وہ تمام خدشے رفع کر دیے۔ نواب محسن الملک مرحوم کے جانشین نواب وقار الملک بہادر اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں سیکرٹری سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس نے جس سرگرمی اور عرق ریزی سے اپنے فرائض ادا کیے ہیں، اس کا شکریہ ادا کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ انھوں نے اس نقصان کی پوری تلافی کی ہے جو نواب صاحب مرحوم کی وفات سے قوم کو پہنچا تھا۔ پھر جس قدر ڈیلی گیٹ ہندوستان کے اطراف و جوانب اور دور دراز مقامات سے تشریف لا کر اجلاس میں شریک ہوئے، اُن میں سے نصف کے آنے کا بھی کسی کو گمان نہ تھا، اور یہ نہایت بیّن ثبوت اس بات کا ہے کہ جو عام غفلت اور بے پروائی اور قومی کاموں کی طرف سے بے اعتنائی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، وہ روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، اور لوگ نہایت شوق اور امنگ سے قومی تقریبوں میں شریک ہونے لگے ہیں۔ اہل سندھ کی طرف سے جو بے توجہی کا گمان تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ بالکل غلط نکلا۔ جس ذوق و شوق سے عام مسلمانان سندھ کانفرنس کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے ہیں اور جو دل چسپی انھوں نے اس موقع پر ظاہر کی ہے، وہ نہایت روشن ثبوت اس بات کا ہے کہ خدا کے فضل سے اُن میں اپنے تنزل کا احساس اور ترقی کا میلان بوجہ احسن پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی برائی بھلائی اور زمانے کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں، اور اپنے خیرخواہوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ بعض نہایت ضروری اور حد سے زیادہ مفید رزولیوشن جو اُن کی عام رضامندی سے پاس ہوئے ہیں، وہ اُن کے جوہر قابل ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ چراغ میں تیل اور بتی سب کچھ موجود ہے، صرف روشنی کرنے کی دیر ہے۔

مگر اے صاحبو! اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو یہ سب

امید افزا علامتیں اولاً افسران سرکاری اور خاص کر جناب ینگ ہسبینڈ صاحب کمشنر سندھ کی توجہ اور ثانیاً جناب آنریبل خان بہادر وزیر خیر پور اور مسٹر دہلوی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں ۔ اگر ایسے ہمدرد قوم جیسے کہ وزیر صاحب اور مسٹر دہلوی ہیں ، سندھ میں دو چار اور پیدا ہو جائیں تو امید ہے کہ بہت جلد سندھ کے دن پھر جائیں گے ۔ جس کام کا بیڑا انھوں نے اٹھایا ہے وہ ایک نہایت عظیم الشان کام ہے اور ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے کہ جب تک اُن کے بہت سے ایسے مددگار اس صوبے میں پیدا نہ ہوں گے جو دم سے ، قدم سے ، درم سے ، قلم سے ان کی امداد نہ کریں اور اُن کی ہمت نہ بندھائیں ، اس مرحلے کا طے ہونا نہایت دشوار ہے ۔ خدا کی ذات مسبب الاسباب ہے ، جب تک اسباب مہیا نہیں ہوتے ، کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آتی ۔ چوں کہ قومی مشکلات کا حل ہونا قوم کی متفقہ ہم دردی و دل سوزی پر موقوف ہے اس لیے جب تک بہت سے قوم کے ہم درد پیدا نہ ہوں گے ، اس مقصد میں کامیابی ناممکن ہے ۔

عاشق کہ شد کہ یار بہ حالش نظر نہ کرد
اے خواجہ! درد نیست وگرنہ طبیب ہست

صاحبو ! سب سے بڑی کامیابی اس سال کی کانفرنس میں یہ ہوئی ہے کہ جس قدر رزولیوشن پاس ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر عملی اور نتیجہ خیز ہیں ، اور گورنمنٹ کی توجہ اور قومی لیڈروں کی کوشش سے امید ہے کہ اُن پر بہت جلد عمل درآمد ہوگا ۔

اب میں تقریر کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کراچی کا اجلاس قوم کے حق میں اور خاص کر اہل سندھ کے حق میں مثمر برکات و منتج حسنات ہو ۔ و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین ۔

۱۲

تقریر بر موقع عطائے خطاب

حکیم اجمل خاں صاحب

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۰۸ع)

۱۹۰۸ع کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب (مرحوم) کو گورنمنٹ ہند نے ”حاذق الملک“ کا خطاب دیا تو حکیم صاحب کو مبارک باد دینے کے لیے ۷ جنوری ۱۹۰۸ع کو باشندگان دہلی کا ایک عظیم الشان جلسہ کمپنی باغ کے ٹاؤن ہال میں نواب امیرالدین احمد خاں صاحب والیِ ریاست لوہارو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا ۔ مولانا حالی اُس وقت اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھتے تھے ۔ چناں چہ آپ نے بھی جلسے میں شرکت فرما کر ایک تقریر کی اور اس کے آخر میں ایک قطعہ پڑھا ۔ یہ دونوں چیزیں یہاں درج کی جاتی ہیں ۔ جناب حکیم صاحب مرحوم اُن رہنمایان ملت میں سے تھے جنھوں نے انگریزوں کے پنجے سے ملک کو نکالنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ۔ آپ کا شمار مجاہدین آزادی کی اولین صف میں ہوتا ہے ۔ انگریز سے جو خطاب آپ کو ۱۹۰۸ع میں ملا تھا ، ترکِ موالات کے زمانے میں

وہ آپ نے گورنمنٹ کو واپس کر دیا ، جس پر قوم نے آپ کو ''مسیح الملک'' کا خطاب دیا ۔ (محمد اسماعیل)

صاحبو! آج ہم ایک ایسی خوشی کے اظہار کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں جس میں امید ہے کہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ دل سے شریک ہوں گے ۔ جس میں بناوٹ اور ظاہر داری کا کچھ لگاؤ نہیں معلوم ہوتا اور جو بعینہ ایسی ہی خوشی ہے جیسی مسلمانوں کو عید بقر عید میں ، ہندوؤں کو ہولی دیوالی میں اور بڑے دن کی تعطیل میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی کانفرنس یا کانگریس کی خوشی ہوتی ہے ۔

جو معزز خطاب گورنمنٹ ہند نے جناب رئیس الاطبا حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو حال میں عطا کیا ہے ، وہ نہ صرف اہل دہلی و نواح دہلی کے ، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصے اور صوبے کے لوگوں کو خوشی کا باعث ہوا ہے ۔ حکیم صاحب جس نام‌ور اور شہرۂ آفاق خاندان کے ممبر ہیں اُس کی نام وری اور شہرت ہندوستان کی حدود سے گزر کر ایشیا کے اکثر حصوں تک پہنچ گئی ہے ۔ اس خاندان نے صرف علم طب ، حذاقت اور دست شفا ہی میں نام نہیں پیدا کیا بلکہ جس فیاضی ، فراخ حوصلگی اور سیر چشمی کا برتاؤ ہر ادنٰی ، اعلٰی ، مقیم ، مسافر اور دور و نزدیک کے ساتھ اس خاندان میں دیکھا گیا ہے ، اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ شاید تمام دنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں اگر نایاب نہیں تو کم‌یاب ضرور ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس گھرانے کی طرف لوگوں کے دل خود بہ خود کھنچتے ہیں ۔ دور دور کے باشندے بیماروں کو لے کر یہاں علاج کے لیے آتے ہیں اور اُن کی عقیدت اور محبت کا نقش دلوں میں لے کر جاتے ہیں ۔

صاجو! ہمارے معزز و محترم ہیرو جن کے خطاب ملنے کی خوشی میں ہم یہاں جمع ہوئے ہیں ، آپ سن چکے ہیں کہ وہ اسی معزز خاندان کے رکن ہیں ۔ ہم گورنمنٹ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ان کا خاندانی خطاب ، خاندانی مطب کی مسند پر بیٹھنے کے چند ہی روز بعد ان کو عنایت فرمایا ہے ۔ بلاشبہ یہ خطاب چوں کہ ان کا خاندانی خطاب اور سلطان وقت کا عطیہ ہے ، جس قدر اُس کی عظمت کی جائے تھوڑی ہے ۔ لیکن اے صاحبو ! 'حاذق الملک' ایک ایسا خطاب ہے جو عام خطابات کی طرح صاحبِ خطاب کی ایک خاص حیثیت پر دلالت کرتا ہے ۔ مگر ہمارے محترم ہیرو میں اور بہت سی ایسی حیثیتیں موجود ہیں جو خاص کر جماعتِ اطبا میں بہت کم جمع ہوتی ہیں ۔ وہ عربی اور فارسی لٹریچر سے خاص مناسبت رکھتے ہیں ، دونوں زبانوں میں مثل اہل زبان کے تکلم کر سکتے ہیں ۔ طب میں بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں ، قومی خدمات سے بہت دل چسپی رکھتے ہیں ، حسن اخلاق کے لحاظ سے میں ان کو ایک غیر معمولی انسان خیال کرتا ہوں ۔ میں اُن کے اخلاق فضائل کا زیادہ ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ اُن کی زیادہ مدح وثنا کہیں اُن کو وسعتِ اخلاق میں زیادہ ترقی کرنے پر آمادہ نہ کرے ۔ اُن کے اخلاق اب اس درجے کو پہنچ گئے ہیں کہ انھوں نے ابنائے جنس کی خدمت پر اپنے ضروری آرام و آسائش کو ، جس کے بغیر انسان کی صحت قائم نہیں رہ سکتی ، قربان کر دیا ہے ۔

بہر حال جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو جو خطاب گورنمنٹ ہند نے عنایت فرمایا ہے ، ایک ایسا موزوں اور چسپاں خطاب ہے کہ اس سے زیادہ مفید اور چسپاں خطاب نہیں ہوسکتا ۔ اور اس خطاب سے صرف حکیم صاحب ہی کا خاندان گورنمنٹ کا شکرگزار نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے عام باشندے ہمیشہ اُس کے احسان مند رہیں گے ۔

(اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ) میں نے اس موقع کے لیے

ایک قطعہ بھی لکھا ہے جس میں میں نے حکیم صاحب سے خطاب کیا ہے ۔ چوں کہ حکیم صاحب اس وقت تشریف فرما نہیں ہیں ، اس لیے میں نواب فیض احمد خان صاحب ہی کو حکیم صاحب کا قائم مقام فرض کر لیتا ہوں :

حاذق الملک ! اس خطابِ فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے
پر یہ ہے کیسی مبارک باد ، ہم حیران ہیں !
گو کہ دل ہر اپنے بیگانے کا اس سے شاد ہے
سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہر خطاب ؟
یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے ، کچھ یاد ہے ؟
یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور
غیب سے یہ آن دعاؤں کی ہوئی امداد ہے
پس مبارک باد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ ، کیا ارشاد ہے ؟

۲۔ تقریظیں

(الف) کتب

۱

تاریخ ہندوستان

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، فائل ۱۸۷۵ع ، صفحہ ۳۸۲)

خان بہادر شمس العلما مولانا ذکاء اللہ نے جہاں سینکڑوں کتابیں حساب ، الجبرا اور جیومیٹری وغیرہ علوم پر لکھیں (جو اب نایاب ہو چکی ہیں) وہاں ایک مفید کام یہ بھی کیا کہ ہندوستان کی ایک نہایت طول طویل اور مفصل تاریخ لکھی۔ اس کتاب کے تین حصے تھے :
(۱) عہد ہنود (۲) عہد اسلامیہ (۳) عہد انگلشیہ۔

۱- پہلا حصہ صرف ایک جلد میں تھا اور اُسے بھی مصنف نے مختصر طور پر بیان کیا تھا۔

۲- دوسرا حصہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ سے متعلق تھا اور سب سے زیادہ طویل اور اہم یہی حصہ تھا۔ یہ حصہ دس بہت موٹی موٹی جلدوں پر مشتمل تھا اور ابتدا سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات و کوائف اس میں نہایت تفصیل اور بڑی تشریح کے ساتھ تمام فارسی اور انگریزی تاریخوں سے لے کر مرتب کیے گئے تھے۔

۳- عہد انگلشیہ کا حصہ پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھا اور یہ پانچوں جلدیں انگریزی تاریخوں سے اخذ کر کے لکھی گئی تھیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر وکٹوریا تک کے حالات ان پانچ جلدوں میں بڑی تفصیل سے قلم بند کیے گئے تھے۔ ہندوستان کی کوئی تاریخ آج تک ایسی مفصل اور مطول نہیں لکھی گئی جیسی مولانا ذکاء اللہ کی یہ تاریخ تھی ، مگر افسوس آج کل بہت ہی کم یاب ہے۔

مولانا حالی کا یہ ریویو اس کتاب کے صرف دوسرے حصے یعنی عہدِ مسلمانان پر ہے جو ۱۸۷۵ع میں شائع ہوا تھا۔ (محمد اسماعیل)

عنوان پر جو نام کتاب کے ساتھ اُس کے نامی گرامی مصنف دام بقائہ کا ثبت کیا گیا ہے ، اس سے ناظرین باتمکین سمجھ گئے ہوں گے کہ کتاب کی عظمت و جلالت کس درجہ کی ہوگی اور ملک میں اُس کی مقبولیت کس حد تک پہنچنے والی ہے۔ کیوں کہ مصنفِ ممدوح اور اس کی بے شمار کتابوں نے جو شہرت اور نیک نامی اقطاعِ ہندوستان میں حاصل کی ہے ، اُس سے یہ بات خوب ثابت ہو گئی ہے کہ اس واجب التعظیم آدمی کی تصنیفات آج کل ملک کے حق میں اکسیر اعظم کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ کتاب اصل میں تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ہندوؤں کے قدیم زمانے کا حال ہے اور یہ حصہ منطبع ہو کر ۱۸۷۳ع میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کی سلطنت کا حال ہے۔ یہ ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے اور ہمارا ریویو زیادہ تر اسی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرے حصے میں سلطنت انگلشیہ کا بیان ہے ، یہ حصہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا مگر اُمید ہے کہ شروعِ ۱۸۷۶ع میں چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ اس کتاب سے پہلے کوئی تاریخ کسی مشرق زبان میں ایسی نہیں لکھی گئی جو ہندوستان کی تمام

سلطنتوں پر حاوی ہو ، بلکہ الفنسٹن کے سوا کوئی ایسا ترجمہ بھی دیسی زبان میں نہیں ہوا ۔ پس اس ضروری تصنیف سے ہمارے ملک کی کتابوں کی صرف مقدار ہی نہیں بڑھی بلکہ ہماری ایک ایسی شدید ضرورت رفع ہوئی ہے جس کا رفع کرنا مصنف جیسے روشن ضمیر اور جواں مرد آدمی کے سوا اوروں سے سخت دشوار تھا ۔ اگرچہ فارسی زبان میں بعض تاریخیں مثل ''تاریخ فرشتہ'' اور ''سیر المتاخرین'' وغیرہ کے ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو بہ نسبت اور کتابوں کے کسی قدر جامعیت رکھتی ہیں ، مگر اس زمانے کا ایک شائستہ محقق اُن کے مطالعے سے ہرگز اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا ۔ ہندوؤں کے قدیم زمانے کے واقعات حال ہی میں یورپ کے البیلے مورخوں نے ایسے ذریعوں سے دریافت کیے ہیں جو قدر و قیمت میں ایشیا کے کشف و کِرامات سے زیادہ گراں بہا ہیں ۔ مثلاً آثار قدیمہ ، پرانے کتبے ، پرانے سکے ، حملہ آوروں کی تحقیقات ، ہندوؤں کی مذہبی کتابیں ، علم تطابق السنہ ، مختلف قوموں کے خط و خال کی مطابقت وغیرہ ۔ جو مراتب ان گراں وزن وسائل سے منکشف ہوئے اور جن کی بدولت ہندوؤں کی قدیم زمانے کی تاریکی بہت کچھ رفع ہوئی ہے ، اُن سے فارسی تاریخیں بالکل معرا تھیں اور اس کے سوا عہد انگلشیہ کی تاریخ آج تک کسی دیسی زبان میں نہیں لکھی گئی ۔ پس یہ کتاب ان دونوں فائدوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخوں میں عدیم النظیر ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی سلطنتوں کا حال جو اس مفید کتاب میں لکھا گیا ہے ، اُس کا عام ماخذ فارسی اور عربی کی بے شمار تاریخیں ہیں جو مختلف آدمیوں نے مختلف سلطنتوں کے حال میں قلم بند کی ہیں ، لیکن قطع نظر اس کے کہ مصنف نے اُن سب کی تلخیص کر کے اپنے ہم وطنوں کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعے سے مستغنی کردیا ، بڑی فوقیت اس کتاب میں یہ ہے کہ ہزاروں نکمی اور فضول باتیں ، جو

مورخ کے ذہن کو جلا کرنے کی جگہ اور زنگ آلودہ کرتی تھیں اور عام تاریخ سے اصلا لگاؤ نہ رکھتی تھیں ، جیسے اہل کاروں کا تقرر و تبدل ، اُن کی ترقی ، اُن کا تنزل ، بادشاہوں کے حضور میں اہل دربار کی طرف سے پیش کش گزرنے ، اہل دربار کو بادشاہوں کی طرف سے خلعت اور انعام یا القاب و خطاب ملنا ، جشنوں کی تیاریاں ، سیر و شکار کے سامان ، شاعروں کی مدح سرائی ، بھاٹوں کی بھٹائی ، شہزادوں کی ولادت ، شادیوں کی دھوم دھام ، نجومیوں کا نیک ساعت بتانا یا زائچہ اور پترا بنانا ، جوگیوں کے ڈھکوسلے ، نقیبوں کی لن ترانیاں ، چھوٹے چھوٹے زمین داروں کی سرکشی ، سینکڑوں قصے اور افسانے خلاف قیاس وغیرہ ۔ ان سب باتوں سے یہ کتاب بالکل پاک و صاف ہے ۔ اور وہ بے بہا اور گراں قدر نتائج جو عام تاریخ کی جان ہیں اور جن سے ایشیائی تاریخیں قطعاً بے نصیب تھیں ، اُن کے لحاظ سے مشرق تاریخوں میں یہ پہلی ہی کتاب ہے ، جس میں یورپ کے روشن ضمیر مورخوں کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے ۔ ہر ایک سلطنت کا اثر جو ملک پر یا ملک کا اثر جو سلطنت پر ہوا ، اس کا بیان ہے ۔ ہر ایک سلطنت کے زوال یا ترقی کے اسباب ، ہر ایک بادشاہ کی خصلتیں اور اُس کا چلن و رویہ ، ہر موقع پر بہ حسبِ ضرورت رائے لگانی اور اس میں تعصب اور طرف داری کو دخل نہ دینا ، اس کتاب کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی چھینٹ تک ہمارے ملک کی تاریخی کتابوں پر نہیں پڑی ۔ تاریخی واقعات کو مصنف مدظلہ نے جس دل چسپ پیرائے میں ادا کیا ہے اور پھر باوجود اس کے کہیں افراط و تفریط کو دخل نہیں دیا ، یہ بات اگر محال نہیں تو تعجب انگیز ضرور ہے ۔ ایک روشن ضمیر عالی دماغ آدمی نے اس کتاب کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ اس میں ہر جگہ دو چار صفحوں کے بعد دس پانچ سطریں ایسی دل چسپ اور دلکش آتی ہیں

جن کو پڑھ کر با مذاق آدمی سر دھننے لگتا ہے ۔ میں نے بھی اس کتاب کو جس قدر پڑھا اُس میں بے شک یہ صفت پائی ۔ بعض جگہ بے اختیار میرا جی بھر آیا اور بعض جگہ میرے دل میں جوشِ محبت پیدا ہوا ، بعض جگہ اُس کے خلاف اثر ظاہر ہوا ، بعضے مقام پر میری کسی قدیم رائے میں تذبذب واقع ہوگیا اور بعضے موقع پر میری کسی رائے کو تقویت حاصل ہوئی ۔ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے ، کسی کی تقلید یا مخالفت سے اپنے دلی خیالات کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ، کیوں کہ جو بات اور کے جی سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی دل نشیں اور دل آویز ہرگز نہیں ہو سکتی ۔ جن بادشاہوں کو یورپ کے تمام مورخوں نے ہدفِ تیرِ ملامت بنا رکھا ہے اور جوشِ تعصب میں اُن کے محاسن اور فضائل پر پانی پھیر دیا ، اس بے تعصب مصنف نے ان کی واقعی خوبیاں بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی ۔ اگر کچھ ان پر اعتراض کیے ہیں تو کسی قدر اُن کی خوبیاں بھی تسلیم کی ہیں ۔ اور جن بادشاہوں کو ہمارے بھولے بھالے سادہ لوح ہم وطن ملکی خصائل سمجھے ہوئے تھے ، اُن کے واقعی عیب بیان کرنے میں کسی کی نکتہ گیری کا اندیشہ نہیں کیا ۔ ہماری دیسی زبان کی تاریخوں میں صرف الفنسٹن کا ترجمہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جس سے ہمارے عام ہم وطن اس تاریخ سے فوائد حاصل کر سکیں لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ آنریبل الفنسٹن صاحب نے جو مضامین مشرق زبان سے اخذ کیے ہیں وہ انگریزی میں پورے پورے ادا ہو گئے ، اور سائنٹفک سوسائٹی نے جو اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ، وہ بے کم وکاست لکھا گیا ، (حالاں کہ یہ دونوں باتیں مشکل سے تسلیم کی جاتی ہیں) تو بھی وہ ترجمہ اس کتاب کی برابری نہیں کر سکتا ۔ اول تو یقیناً اس میں صدہا واقعات مندرج ہیں جن کا الفنسٹن میں کہیں پتا اور نشان نہیں ، حالانکہ مورخوں کے نزدیک جس نئی تاریخ میں تواریخِ ماضیہ کی نسبت دو چار باتیں بھی نئی حاصل ہو سکیں وہ بے انتہا قدر کرنے کے لائق ہوتی ہیں ۔ دوسرے جب کوئی شخص کسی غیر قوم یا غیر ملک کی تاریخ اپنی مادری زبان میں لکھتا ہے تو اپنی زبان کی رعایت سے اس کو بالضرور مطلب نگاری میں ایسی روش اختیار کرنی پڑتی ہے جو غیر زبان والوں کو ہرگز مطبوع نہیں ہو سکتی ۔ اور جب اس کا ترجمہ کسی تیسری زبان میں ہوتا ہے تو اس کی مثال بعینہ ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک یورپین آدمی جس کا باپ یورپین اور ماں ہندوستانی اور دودھ پلانے والی امریکن ہو ۔ نہ اُس میں اصل زبان کی خوبی باقی رہتی ہے ، نہ دوسری اور تیسری زبان کا رنگ قائم رہتا ہے ۔ تیسرے الفنسٹن صاحب کی کتاب پر جو تعصب کا الزام لگایا گیا ہے ، وہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم تاریخِ ہندوستان کی واقفیت کا ذریعہ کسی ایسی کتاب کو ٹھہرائیں جس کا مصنف تعصب سے بالکل مبرا ہو ۔ پس ہم اپنے ہم وطنوں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اُن کے ایک ہم درد اور خیرخواہِ وطن نے اُن کے ملک کے قدیم اور جدید اور درمیانی زمانوں کے تاریخی حالات نہایت راستی اور درستی کے ساتھ تحریر کر کے اُن کے لیے ایک ایسا سرمایہ مہیا کیا ہے جس کے وہ سخت ہی حاجت مند تھے ۔ خاتمِ آل تیمور کی نسبت جو مصنف نے اپنی عادت کے موافق آزادانہ گفتگو کی ہے اور مناقبت کے ساتھ کسی قدر معائب بھی بیان کیے ہیں ، اس میں شک نہیں کہ اُس نے واقعے میں اپنا فرض ادا کیا ہے ، مگر مجھ کو امید نہیں کہ ہمارے دیرینہ سال یا دیرینہ خیال ہم وطن ایسی آزادانہ تحریر کو پسند کریں ۔ ہمارے ملک پر ابھی آزادی کا پرچھاواں نہیں پڑا ۔ ہم لوگ ہرگز نہیں چاہتے کہ جس شخص کو ہم میں سے سو پچاس آدمی کسی نیک صفت کے ساتھ متصف جانتے

ہوں ، اُس کی کوئی برائی واقعی یا غیر واقعی ہمارے سامنے بیان کی جائے ۔ مثلاً جو شاعر ہمارے نزدیک مسلم الثبوت ہے ، ضرور ہے کہ ہم اُس کے تمام کلام کو الہامی کلام کی طرح تمام عیوب سے پاک سمجھیں ۔ اور مثلاً جس بادشاہ میں ایک رحم دلی کی صفت ہے ، ضرور ہے کہ ہم اُس کو بلا تشبیہ انبیا کی طرح معصوم جانیں ۔ لیکن ہم مصنف کی طرف سے ایک جواب دیتے ہیں جس کو شاید پرانی طبیعت کے لوگ بھی رد نہ کریں گے : ناظرین کا فرض ہے کہ اگر سب نہیں تو صرف سلاطین مغلیہ کا حال بابر سے لے کر بہادر شاہ تک اول انگریزی تاریخوں میں دیکھیں ، پھر اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف کریں کہ اُن کے معزز ہم وطن نے اپنے ملک کے اگلے بادشاہوں کو اہل یورپ کے مطاعن سے کس قدر بچایا ہے ۔ اور جس قدر اُن کی برائیاں اُس نے تسلیم کی ہیں اُن کا تسلیم نہ کرنا اپنے تئیں مورخینِ صداقت آئینَ کے زمرے سے خارج کر دینا تھا یا نہیں ؟ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندُوستان کی تاریخ اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں آئی کہ جس کو وہ چاہیں آسمان پر چڑھائیں اور جس کو چاہیں تحت الثریٰ تک پہنچا دیں ۔ اب اس تاریخ کی مالک وہ قوم ہے جس کے آگے بغیر حجت و دلیل کے کسی کی تعریف یا تنقیص پیش نہیں چل سکتی ۔ جس شخص کے لیے اُنھوں نے پچاس عیب ثابت کیے ہیں ، ہم اُس کی کیسی ہی طرف داری کریں مگر اُس کے دس پندرہ عیب بے شک ماننے پڑیں گے ، ورنہ ہم کو راستی سے ضرور ہاتھ اٹھانا پڑے گا ۔

۲

نظم الممالک

ترجمہ

اقوام المسالک فی معرفت احوال الممالک

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، فائل ١٨٧٥ع ، صفحہ ٦٣٥)

یہ یورپین ممالک اور اقوام کی ایک تاریخ ہے جو عربی زبان میں افریقہ کے عربی ملک ٹیونس کے وزیر السلطنت سید خیر الدین احمد نے نہایت تفصیل کے ساتھ بہت عالمانہ اور محققانہ طور پر لکھی ہے ۔ اس کے طویل مقدمے میں سارا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ یورپ کی جو باتیں عمدہ اور قابل ستائش ہیں وہ اپنی بہتری اور ترقی کے لیے اختیار کر لینی چاہئیں ، اور جو عادتیں فضول اور لایعنی ہیں ان سے کنارہ کشی کرنی چاہیے ، تا کہ ہم علمی اور عملی میدان میں یورپ کے دوش بدوش ترقی کر سکیں ۔ مقدمے کے بعد اصل کتاب میں یورپ کے ہر ملک کی الگ الگ تاریخ اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور ہر ملک کے بادشاہوں کی فہرست بھی بقیدِ سنہ دی گئی ہے ۔

جب یہ کتاب چھپ کر ہندوستان پہنچی تو اُس زمانے میں نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب رئیس لوہارو کلکتے گئے اور یہ کتاب خرید کر لائے اور مجلس

> خزینۃ البضاعۃ علی گڑھ کی نذر کر دی ۔ وہاں سرسید مرحوم نے اس کتاب کو دیکھا تو انھیں بے حد پسند آئی اور انھوں نے خلیفہ سید محمد حسن وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کو دکھا کر اس کے اردو ترجمے کی سفارش کی ۔ خلیفہ صاحب نے اس کے ترجمے اور طباعت کا سارا خرچ اپنی جیب سے دیا ۔ کتاب چھپ گئی اور اس کا سارا منافع علی گڑھ کالج کو دیا گیا ۔ مترجم مولوی محمد اسماعیل صاحب ایڈیٹر اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ تھے ۔ جنھوں نے بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ اسے عربی سے اردو میں منتقل کیا ۔ آج کل یہ کتاب نایاب ہے اور کہیں نہیں ملتی ۔ مولانا حالی کی لائبریری میں میں نے خود اس کتاب سے بارہا استفادہ کیا ہے ، مگر ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز آندھی میں ساری لائبریری کے ساتھ یہ کتاب بھی برباد ہوگئی ۔ مولانا حالی کا اس کتاب پر ریویو ۱۸۷۵ء کے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے صفحہ ۶۳۵ پر شائع ہوا تھا جہاں سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

عرب سرائے کی علمی سوسائٹی نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس مفید کتاب کو اول سے آخر تک دیکھ کر اس کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کروں اور یہ بھی لکھوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرانا اور اس کو چھپوا کر شائع کرنا ہندوستان کے حق میں کس قسم اور کس درجے کے فائدے رکھتا ہے ، اور اس پر کیا کیا نتائج مترتب ہونے کی امید ہے ۔ اقوام المسالک کا مصنفِ عالی مقام ایک روشن ضمیر اور مدبر عالم سید خیرالدین احمد وزیرِ سلطنت ٹیونس ہے جو علم و فضل اور عقل و دانش اور حدس صائب اور

رائے سلیم کے سوا قومی ہمدردی کے نشے میں چور معلوم ہوتا ہے اور جس نے بنی نوع بشر کی خیر خواہی میں اپنی گراں بہا عمر کا ایک بڑا حصہ نہایت مفید طور پر صرف کیا ہے ۔

ٹیونس افریقہ میں ملکِ بربر کے چار مختلف صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے جس کا دارالسلطنت خاص شہر ٹیونس ہے ۔ اس شہر میں تقریباً ایک لاکھ آدمی رہتے ہیں جس میں چالیس ہزار یہودی اور باقی مسلمان عرب وغیرہ آباد ہیں ۔ یہ صوبہ ممالکِ بربر میں بہت بڑی تجارت گاہ ہے ۔ یہاں کے باشندے عموماً صاحبِ لیاقت اور شائستہ ہوتے ہیں اور یہاں کا بادشاہ اپنے ملک میں اقتدارِ مطلق رکھتا ہے ۔

یہ کتاب ایک نہایت طولانی مقدمے اور دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ یہ طولانی مقدمہ ساری کتاب کی جان ہے اور اس سے جس قدر مصنف کی روشن ضمیری اور بالغ نظری ثابت ہوتی ہے ، اس کا اندازہ کرنا میری طاقت سے باہر ہے ۔ ہمارے ہم وطنوں کے لیے عموماً اور ہمارے بھائی مسلمانوں کے لیے خصوصاً اس مقدمے کا ایک ایک جملہ ناصحِ مشفق اور ہادیِ برحق کا کام دیتا ہے ۔ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب کسی غیر مذہب قوم میں کوئی اچھی خصلت یا مفید بات پائی جائے اور لسانِ شرعی اس کی تقبیح سے ساکت ہو ، تو ہم کو صرف اس خیال سے کہ ہمارے غیر مذہب والوں میں یہ بات پائی جاتی ہے ، اس کے اخذ کرنے میں ہرگز تامل کرنا نہیں چاہیے ۔ اس بات کی تائید کے لیے بہت سی عقلی اور نقلی دلیلیں پیش کی ہیں جن کے دیکھنے سے منصف مزاج آدمی کا شک بالکل زائل ہو جاتا ہے ۔ اس مقام پر وہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے جس سے ثابت ہے کہ غزوۂ احزاب میں جو ہمارے نبیِ برحق نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا ، وہ اہل فارس کا اتباع تھا اور اسی موقع کے مناسب کتاب 'سنن المہتدین' نے ایک

نہایت شافی قول نقل کیا ہے اور حاشیہٴ ’درّ مختار‘ میں جو علامہٴ عصر شیخ محمد بن عابد حنفی نے تصریح فرمائی ہے، وہ بھی نقل کی گئی ہے: یعنی یہ کہ ’’جن باتوں میں مخلوق خدا کی بہتری اور ترقی ہو اگر اُن کے کرنے میں ہم کسی غیر ملت قوم کے ساتھ مشابہ ہو جائیں تو کچھ خرابی نہیں ہے۔‘‘ اس کے بعد مصنفِ عالی مقام نے ایک نہایت لطیف بات لکھی ہے جس کو یہاں نقل کیے بغیر میں ہرگز نہیں رہ سکتا: یعنی یہ کہ ’’بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ فرنگیوں کی باتوں کے اتباع سے سخت انکار کرتے ہیں، وہ اُن کی بھلائی کی باتوں میں تو انکار کرتے ہیں اور جو باتیں اُن کے حق میں مضر ہیں اُن میں اُن کی مشابہت سے کچھ ان کو انکار نہیں۔ مثلاً وہ لوگ صریح فرنگیوں کا بُنا ہوا کپڑا پہن کر خوش ہوتے ہیں اور انہیں کا بنا ہوا اسباب گھروں میں رکھتے ہیں اور انہیں کے بنائے ہوئے ہتھیار اور ضرورت کی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں، مگر اُن چیزوں کو خود تیار کرکے کام میں لانے سے بڑا پرہیز کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پرہیز کرنے میں اُن کے ملکی انتظام اور ملکی ترقی دونوں میں بڑا نقصان اور خرابی پڑتی ہے۔‘‘ اس مضمون سے ہماری قوم (بشرطیکہ اُس کے ادبار کے دن پورے ہو گئے ہوں) بہت کچھ عبرت حاصل کر سکتی ہے کیونکہ جس تعصب نے اُن کو یہ روزِ سیاہ دکھایا ہے اور اس پستی اور تنزل کی حالت کو پہنچایا ہے، یہ مضمون اُس کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ اس کے بعد خود مختاری اور شخصی حکومت کے برے نتیجے اور جمہوری اور محدودالاختیار سلطنتوں کی خرابیاں اس شرح و بسط اور لطف و خوبی اور حجت و برہان کے ساتھ بیان کی ہیں کہ اب سے پہلے کسی مشرق زبان کی کتاب میں نہیں لکھی گئیں۔ چونکہ تمام اشیاء کی کماھی

حقیقت اُن کے اضداد کے مقابلے سے معلوم ہوتی ہے اور ہمارے ہم وطنوں نے آنکھ کھول کر ایک آزاد گورنمنٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور شخصی حکومتوں کے جور نہیں اُٹھائے، اس لیے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اس مضمون کو دیکھ کر انگریزی گورنمنٹ کی قدر کماحقہ پہچانیں گے، اور جو دولت (یعنی آزادی) خدا تعالیٰ نے اُن کو بِن مانگے دے رکھی ہے، اُس کا شکریہ تہِ دل سے ادا کریں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی جو ثروت اور شان و شوکت اور علمی و عملی فوقیت زمانہٴ سابق میں تمام دنیا کی قوموں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے، گویا غیرت مند مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلائی ہے کہ افسوس و صد ہزار افسوس! جس اولوالعزم قوم نے مشرق سے مغرب تک علم و حکمت کی روشنی پھیلائی، اور جنھوں نے حسبِ شہادت وزیر اعظم فرانس، اہل یورپ کو جہالت کی تاریکی اور ظلمت سے نکالا، اور جن کی بدولت بغداد و بصرہ سے لے کر مصر اور فارس تک، اور سمرقند سے لے کر غرناطہ اور قرطبہ تک اکثر بلادِ یورپ و ایشیا و افریقہ مرکز علوم و فنون قرار پائے، اور جن کی اُستادی اور حقِ تربیت کو آج تک یورپ کے منصف مزاج مورخ مانتے چلے آتے ہیں، اُن کی اولاد ایسی وحشت اور تاریکی کے گڑھے میں اُتر جائے جس میں سے نہ آپ اُبھر سکے، نہ کسی کی مدد سے اُبھرنے کا ارادہ کرے۔

اس کے بعد اہل یورپ کی تحقیقات اور ایجادات کا بیان اور فرانس میں تعلیم اور تعلّم کے طریقے، وہاں کے کتب خانوں کی کثرت اور اُن کے عمدہ انتظام، امیر زادوں کی تعلیم اور انواع و اقسام فنون میں اُن کا ترقی کرنا، لفظ آزادی کی شرح، یورپ میں موجد اور مخترع لوگوں کے حقوق کا بیان اور ان کے سوا اور بے شمار مضامین نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں جن کو دیکھ کر

ہمارے ہم وطن اپنے اور یورپ کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں تو اس بات کا اقرار کر سکتے ہیں کہ فی الحقیقت ہماری موجودہ حالت اہل یورپ کی حالت کے ساتھ وہ نسبت رکھتی ہے جو ڈھور اور ڈانگروں کو انسان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد پہلا حصہ شروع ہوتا ہے، جس کے بیس باب ہیں اور ہر ایک باب میں یورپ کی ایک ایک سلطنت کا حال مندرج ہے۔ ہر سلطنت کی تاریخ اور اُس کی وسعت و حدود اور اُس کے اصول و قوانین اور طریقۂ سیاست اور طرز انتظام اور رعایا کی حالت اور ہر ایک کی مالی اور جنگی قوتیں اور محاصل کے ذریعے، مثل زراعت اور نباتات اور معدنیات اور حیوانات اور تجارت اور صنائع وغیرہ، اور بعض ابواب میں ان کے سوا اور خصوصیاتِ ملک کا نہایت کافی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ جغرافیۂ ارض اور اقسام کرۂ زمین کے بیان میں ہے، اور اخیر میں ایک جدول ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دریافت کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں حصے بھی عام ہندوستانیوں کے حق میں، جنھوں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی، ایک خزانۂ غیبی کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی کتاب ہماری دیسی زبانوں میں ایسی نہیں لکھی گئی ہے جس میں یورپ کی تمام سلطنتوں اور اقسام کرۂ زمین کا حال مجملاً یا مفصلاً لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کی تعریف میں بالاجمال صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس نے ہمارے ملک اور ہماری قوم پر شائستگی کا دروازہ کھولا ہے، اور اگر ہماری افسردہ طبیعتوں میں کسی قدر قابلیت کا مادہ ابھی تک باقی ہے، تو یہی کتاب ہماری شائستگی کی از سرنو بنیاد ڈالنے کے لیے کافی و وافی ہے۔ ہم کو سب سے پہلے مصنفِ عالی مقام کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے ہمارے اور ہمارے تمام بنی نوع کے لیے ایسی شمع ہدایت روشن کی۔ من بعد جناب مستطاب نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب بہادر رئیس لوہارو کا شکر گزار ہونا چاہیے، جنھوں نے کلکتے کے سفر میں یہ گراں مایہ جواہر بہم پہنچا کر مجلس خزینة البضاعة میں ہدیةً پیش کیا۔ بعد ازاں اُس ہوا خواہِ ملک اور جان نثارِ قوم کا شکریہ بھی بقدر طاقت ادا کرنا ضرور ہے جس کے احسانات سے ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے، یعنی سیدالقوم اور خادم القوم جناب مولوی سید احمد خاں بہادر سیکرٹری مجلس خزینة البضاعة، جنھوں نے اس کتاب کو قوم کے حق میں نافع سمجھ کر اپنے اخبارِ گوہر بار کے ذریعے سے بار بار اس کی خوبیاں جتائیں اور قوم کے دلوں کو اس کے مطالعے یا اشاعت کی طرف مائل کیا۔ اور سب سے زیادہ ہمارے شکر کا استحقاق اُس ذات فیض آیات کو ہے جنھوں نے محض رفاہِ قوم کے لیے اپنی جیب خاص سے ایک گراں مقدار رقم صرف کر کے اُس کے ترجمہ کرانے اور چھپوانے اور رواج دینے میں کوششِ بلیغ مبذول فرمائی اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کر دیے؛ یعنی جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب وزیر اعظم ریاست پٹیالہ جنھوں نے قوم کی ہمدردی کا بیڑا اٹھا کر بہت کچھ کر دکھایا اور ابھی قوم کو اُن سے بہت کچھ اُمیدیں باقی ہیں۔

یہاں تک جس قدر میں نے لکھا وہ اصل کتاب اقوام المسالک سے تعلق رکھتا تھا۔ نظم الممالک ترجمۂ اقوام المسالک کی نسبت ابھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ترجمہ جناب خلیفہ صاحب ممدوح کے ارشاد سے جناب مولوی محمد اسماعیل صاحب ایڈیٹر اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے عربی سے زبانِ اُردو میں تحریر فرمایا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح کی لیاقت اور علم و فضل اور سلیقۂ وقائع نگاری اور متانت اور سنجیدگی کمال شہرت اور بلند آوازگی کے سبب کسی

کی تعریف کی محتاج نہیں ہے ۔ اس ترجمے کے حق میں کوئی ستائش کا کلمہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا لکھنے والا وہ ذی لیاقت شخص ہے جس کے حسن اہتمام سے سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا عدیم النظیر اخبار نکلتا ہے ۔ اگرچہ اقوام المسالک ، جو عربی زبان میں ہے ، وہ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزری اور کسی ترجمے کی نسبت صحیح صحیح رائے اسی وقت دی جا سکتی ہے جب کہ اصل کتاب پیش نظر ہو ، مگر جو مراحلِ دشوار گزار اس واجب التعظیم مترجم کو طے کرنے پڑے ہوں گے ان کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے ۔ عربیٔ قدیم کا ترجمہ اردو میں کرنا کچھ مشکل بات نہیں ہے اور اسی طرح انگریزی کا ترجمہ کرنا بھی چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا ۔ کیوں کہ عربیٔ قدیم کی متعدد فرہنگیں اور انگریزی کی بےشمار ڈکشنریاں موجود ہیں ۔ ہاں مگر زمانۂ حال کی عربی کا ترجمہ کرنا ایک ایسا دشوار کام ہے جس سے عہدہ برآ ہونا محال معلوم ہوتا ہے ، علی الخصوص جب کہ زمانۂ حال کی عربی میں کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو سر تا پا مغربی خیالات سے بھری ہوئی ہو ۔ زمانۂ حال کی عربی میں ہزاروں لغات مولدہ ایسے شامل ہو گئے ہیں جن کا صحاح و قاموس و صراح میں کہیں پتا نہیں ۔ اس کے سوا ترکی الفاظ عربیٔ حال میں اس قدر مخلوط ہیں جیسے اردو میں عربی یا فارسی الفاظ ملے ہوئے ہیں ، اور سب سے بڑھ کر یہ دقت واقع ہوئی ہے کہ ہزاروں الفاظ انگریزی اور فرانسیسی اور لاطینی اور یونانی زبان کے اہل مصر اور اہل روم نے معرّب کر کے اپنی زبان میں داخل کر لیے ہیں ۔ ان الفاظ کی صورت اپنی اصلی ہیئت سے اس قدر متجاوز ہو گئی ہے کہ ان کا سراغ لگانا سخت دشوار ہے ۔ نہ عربی لغات میں ان کا وجود ہے ، نہ انگریزی ڈکشنریوں میں ان کا نشان ہے ۔ ان تمام وجوہ سے اس دقت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اقوام المسالک کے ترجمے میں مترجم صاحب کو پیش آئی ہوگی ۔ با ایں ہمہ عام ترجمہ کمال خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ اگرچہ ظاہرا بعض مضامین میں ایک نوع کی پیچیدگی اور فی الجملہ الجھاؤ پایا جاتا ہے ، مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین فی نفسہ دقیق اور پیچیدہ ہیں جن کے پورا پورا ادا کرنے سے ہمارے ملک کی ادھوری زبان قاصر ہے ۔ بعض مقام پر جو جناب مولوی سید احمد خان بہادر نے اپنے قلم سے حواشی تحریر فرمائے ہیں ، وہ نہایت گراں قیمت ہیں ۔ اس ترجمے میں ایک امر تنقیح طلب ہے جس کے ذکر سے قطع نظر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ؛ جو کتابیں فی زماننا مصر وغیرہ میں مغربی زبانوں سے ترجمہ ہوتی ہیں یا اہل مغرب کے طریقے پر لکھی جاتی ہیں ، ان کی نسبت ہندوستانی مترجموں کے دو قول ہیں : ایک یہ کہ انگریزی یا فرانسیسی الفاظ ، جو اہل مصر وغیرہ نے معرّب کر کے اپنی تصانیف میں داخل کیے ہیں ، جب ان کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو ان کو اسی تعریب کی حالت پر رکھنا چاہیے ۔ دوسرے یہ کہ تا بہ مقدور ان کو اپنے اصل کے موافق لکھنا چاہیے ۔ میری رائے میں پچھلا قول بہ نسبت پہلے کے اقویٰ ہے ، اور دلیل اس کی قوت کی ظاہر ہے ۔ لیکن اس ترجمے میں زیادہ تر قولِ اول کے مطابق عمل کیا گیا ہے اور اس سے جو دقتیں ناظرین کو پیش آتی ہیں ، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ آدمیوں اور مقامات اور جزائر وغیرہ کے بے شمار نام ، جو اس ترجمے میں لیے گئے ہیں ، وہ ناظرین کو نہایت تشویش میں ڈالتے ہیں ۔ ہندوستان کا آدمی کیسا ہی جغرافیہ داں ہو ، ان اسماء کو سن کر بغلیں جھانکنے لگتا ہے ۔ چند مثالیں جو اس وقت ہمارے ذہن میں حاضر ہیں ، یہاں لکھی جاتی ہیں : مثلاً میونیشیا کی جگہ میانس ، سینٹ ٹامس کی جگہ سان توماس ،

سینٹ برنارڈ کی جگہ صان برنار ، سینٹ ہلینا کی جگہ صانت الان ، آگسٹس کی جگہ اغسطوس ، پوپ لیو دسویں کی جگہ بابا لیون عاشر ، پوپوں کی جگہ بابوات ، کرسٹوفر کولمبس کی جگہ کولوب ، جزائر ماریشس کی جگہ جزائر موریس ، سینگال اور گنی کی جگہ سنیغال اور غنی ۔ اس قسم کے الفاظ اگر بالاستیعاب لکھے جائیں تو ایک جدا مجلد مرتب ہو جائے ۔ پس میری رائے یہ ہے کہ طبع ثانی میں ضرور اس کی ترمیم کی جائے ۔ اگرچہ اس درستی میں کسی قدر دقت بے شک اٹھانی پڑے گی مگر جو فوائد اس کتاب کے ترجمے سے متصور ہیں ، وہ خاص و عام کو برابر اور بے تکلف پہنچیں گے ۔

۳

نیرنگ خیال

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، فائل ۱۸۸۰ع ، صفحہ ۳۶۱)

”نیرنگ خیال“ (شمس العلماء) مولانا محمد حسین آزاد کے اُن رمزیہ اور تمثیلی مضامین کا مجموعہ ہے جو نہایت فصاحت و بلاغت اور کمال ندرت کے ساتھ اُنھوں نے وقتاً فوقتاً ملک کے جرائد و رسائل میں لکھے ۔ یہ مضامین ایسے عجیب اور دلآویز ہیں کہ اپنی انشا پردازی اور شاعرانہ بلند پروازی کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ ادب و انشاء کا یہ دلفریب نمونہ دو جلدوں میں شائع ہوا تھا مگر مولانا حالی کا ریویو ان میں سے پہلے حصے پر ہے ۔ دوسرا حصہ اُس وقت تک شائع نہیں ہوا تھا ۔

’نیرنگ خیال‘ کے اکثر مضامین کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ماہ نامہ ”رسالہ“ انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور میں بالاقساط شائع ہو چکے تھے ۔ وہیں سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد نے بعد میں نیرنگ خیال کے دونوں حصے مرتب کرکے چھپوائے ۔

(محمد اسماعیل)

اس کتاب کے مصنف اُن قابلِ ادب شخصوں میں سے ہیں جن کی تصنیفات نے تمام سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اپنا احسان مند کیا ہے اور جن کے مضامین اور خیالات سے اہل پنجاب نے بہت کچھ فائدہ

اٹھایا ہے ۔ اگرچہ کسی ملک یا کسی قوم میں اہل کمال کا نفس وجود ہی اس ملک یا اُس قوم کا فخر کا باعث ہوتا ہے ، لیکن حقیقت میں فخر انھیں لوگوں پر کرنا بجا ہے جو اپنے ہنر اور کمال کی روشنی سے اپنے وطن یا قوم کو منور کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اُن سے بھی زیادہ واجب التعظیم وہ لوگ ہیں جو اپنی بیش بہا کوششوں کا ثمرہ یقیناً اپنی زندگی میں نہیں پا سکتے اور پھر بھی کوشش کیے جاتے ہیں ۔ وہ اُس مجلس میں جہاں مرہٹی اور بارہ ماسے کے شوقین جمع ہیں دھرپت اور خیال الاپتے ہیں ، مگر ان کی الاپ اس وقت پیاری معلوم ہو گی جب ایسی ایسی کئی مجلسیں برخواست ہو جائیں گی ۔ اگرچہ ہمارے ملک کے تمام علوم و فنون نہایت پستی کی حالت میں ہیں مگر ہمارا علم انشا سب سے زیادہ تأسف کے قابل ہے ۔ آج تک ایک ایسی ڈکشنری بھی ، جو عام ہندوستانیوں کے لیے مفید اور زبان کے ضروری حصے پر حاوی ہو ، تیار نہیں ہوئی ۔ آج تک ایک ایسی گریمر بھی ، جس میں نہایت ضروری قواعد منضبط ہوں ، نہیں لکھی گئی ۔ جب کہ یہ ابتدائی مراتب بھی اب تک طے نہیں ہوئے تو اور باتوں کا کیا ذکر ہے ۔ نظم میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اس قدر محدود ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ اور جو خیالات اُن الفاظ کے ذریعے سے ادا کیے جاتے ہیں ، وہ چند معمولی ، فرسودہ اور بوسیدہ مضامین کے سوا کچھ نہیں ۔ نثر میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے وہ انھیں دس بارہ برسوں میں ہوئی ہے لیکن زیادہ تر اُس کا پھیلاؤ عرض و طول میں ہوا ہے ، ارتفاع میں وہ ویسی ہی پست ہے جیسے ہمارے مکانوں کے تلیچے ۔ تاریخ ، تذکرہ ، قصہ ، مثنوی ، غزل ، قصیدہ اور اور تمام اقسامِ نظم و نثر کی قدیم روش میں کوئی تغیر اس سے زیادہ نہیں ہوا کہ بعض لوگ اگلی روش کو ناپسند کرنے لگے ہیں ۔ مگر یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص

بہلی اور چھکڑے پر ہنستا ہے مگر کوئی نمونہ ایسا نہیں دکھاتا جس کے آگے بہلی اور چھکڑا عام لوگوں کی نظر سے خود بخود ساقط ہو جائے ۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ایسا نمونہ دکھانا اور اس کو پسند خاص و عام کے لائق بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مصنف نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کام اعلیٰ درجے کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے سرانجام ہوگا ، مگر میری رائے بالکل اس کے برخلاف ہے ۔ میرے نزدیک جب تک ہمارے اہل وطن مغربی علوم اور مغربی لٹریچر اپنی دیسی زبان میں نہ سیکھیں گے ، کبھی اُن کے خیالات میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ فرض کرو کہ ایک باغ میں تمام دنیا کی نباتات اور گل بوٹے فراہم کیے گئے ہیں اور اس کا اصلی مقصد علم نباتات کی تحقیقات ہے ، لیکن اگر اُس باغ کی ترتیب اور آرائش اور صفائی بھی ایسے نرالے ڈھنگ کی ہے کہ کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری ، تو ہم کبھی اُس کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہماری سیر اور نظر اُس کی بیرونی نمائش اور اعجوبگی میں محدود رہے گی ۔

انگریزی زبان، جو ہماری زبانوں سے بون بعید رکھتی ہے ، اُس کے اُلجھاؤ ایسے نہیں ہیں جو طالب علم کو زبان کے پیچ و خم سے آگے بڑھنے دیں ۔ وہ لغات اور محاورات کی تفتیش اور تجسس میں ایسا مستغرق رہتا ہے کہ مغربی خیالات ، جو انگریزی زبان کی جان ہیں ، اُس کی طبیعت پر اپنا رنگ نہیں جما سکتے ۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے آج تک کسی اپنے ہم وطن بی ۔ اے یا ایم ۔ اے کی کوئی تصنیف و تالیف ، جو اس کی عالی دماغی یا وسعت خیال پر گواہی دیتی ہو ، یا ملک کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ رکھتی ہو ، نہیں دیکھی ۔ برخلاف اس کے اُن لوگوں نے ، جن کے دامن انگریزی زبان کی

خاردار جھاڑیوں میں نہیں الجھے (یعنی جنھوں نے انگریزی زبان کو انگریزی انشا میں کمال حاصل کرنے کے لیے نہیں سیکھا) یا جن کے دماغ میں مغربی خیالات کی لپٹ کسی مشرق زبان کے ذریعے سے پہنچی ہے ، اپنی تصانیف اور تراجم سے اہل وطن کو اس قدر فائدہ پہنچایا ہے کہ جس قدر روشنی آج عام ہندوستانیوں میں عام پائی جاتی ہے ، وہ انھیں کی بدولت پائی جاتی ہے ۔

مصنفِ نیرنگ خیال (دام بقائہم) بھی انھی واجب التعظیم لوگوں میں سے ہیں ۔ ہم نے ہمیشہ ان کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے کہ جس قدر واقفیت کا سرمایہ فراہم ہو وہ وقتاً بعد وقت اہل وطن کی ضیافت طبع میں صرف ہوتا رہے ۔ جس قدر آن کے افادات کتابوں اور رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے شائع ہو چکے ہیں ، ہمارے قیاس میں ان سے دہ چند آن کے پاس مرتب اور تیار ہوں گے جو اہل وطن کی بے پروایی اور ناقدردانی کے سبب سے اب تک شائع نہیں ہوئے ۔ مگر جب تک ہمارے ہم وطنوں کے کانوں میں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی صدائیں بھری ہوئی ہیں ، ایسی نا آشنا آوازوں کو کون سنتا ہے :

مشامت اختلال آباد بوی سیر و انگوزہ
شمیمِ مشک و بوی عنبر سارا چہ میدانی

یہ کتاب جس وقت ہمارے ہاتھ میں آئی ، ایک ہی جلسے میں دو ثلث سے زیادہ دیکھی گئی ۔ جو ذوق اور خوشی ہم کو اس کے دیکھنے سے ہوئی ، وہ ہم کو مصنف کی شکر گزاری پر مجبور کرتی ہے ۔ اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے آردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں ۔ طبیعیات ، کیمسٹری ، طب ، فلسفہ ، منطق ، ریاضی کی تمام فروعات ؛ ہیئت ، حرکت و سکون وغیرہ وغیرہ بقدر ضرورت ہماری دیسی زبان میں موجود ہیں ۔ بہت ضروری تاریخیں اور کچھ

ناول بھی ترجمہ ہوئے ہیں ۔ جغرافیے بھی لکھے گئے ہیں مگر مغربی شاعرانہ خیالات کی جھلک تک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی ۔ نیرنگ خیال پہلی ہی کتاب ہے جس نے اس سر بستہ قفل کو کھولا ہے اور اہل وطن کے لیے علم انشا کی ترقی کا ایک نیا رستہ نکالا ہے ۔ یہ کتاب دیباچے کے علاوہ ۹ ایسیز یعنی جواب مضمونوں پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب تفصیل ذیل ہیں :

(۱) آردو اور انگریزی انشا ۔ (۲) آغاز آفرینش میں دنیا کا کیا رنگ تھا اور پھر رفتہ رفتہ کیا ہو گیا ؟ (۳) سچ اور جھوٹ کی لڑائی (۴) امید ۔ (۵) سیر زندگی ۔ (۶) انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا ۔ (۷) علوم کی بد نصیبی ۔ (۸) علم اور ذکاوت کا مقابلہ ۔ (۹) شہرت عام اور بقاے دوام ۔

پہلے مضمون میں اول مطلق زبان کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ کیا چیز ہے ۔ اور اس کی ماہیت بہت سی تمثیلوں کے پیرایے میں ظاہر کی ہے ۔ پھر آردو میں جو قصور اور نقصان ہیں وہ بتلائے ہیں اور یہ جتایا ہے کہ زیادہ تر آس کا قصور اور نقصان اس سبب سے ہے کہ اس کو پیدا ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں گزرے اور وہ سلطنتِ انگریزی کے عروج سے پہلے روزمرہ کی گفتگو کے سوا کسی کام میں نہیں آئی ، مگر انگریزی حکومت کی ترقی کے ساتھ آس نے بھی ترقی کرنی شروع کی اور اب جس قدر ہندوستان میں علوم کی ترقی ہوگی ، آسی قدر زبان کو ترقی ہوگی ۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اصنافِ نوعِ بشر کے طبعی خیالات سب آپس میں متقارب اور متشابہ ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں وقت ، غصہ ، عشق ، شہرت اور حسن کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ جن پیرایوں میں ان چیزوں کو اہل مغرب نے بیان کیا ہے ، انھی کے قریب قریب مشرق زبانوں میں اہل مشرق نے بیان کیا ہے ، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر

اُردو زبان کے علم انشا میں انگریزی لٹریچر کی چاشنی دی جائے تو کوئی بعید اور دشوار بات نہیں ہے اور اُردو کی اصلی ترقی اسی بات پر موقوف ہے۔

دوسرے مضمون میں اول ابتدائے آفرینش کی خالص نیچرل حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ دنیا کو ملکِ فراغ اور خسروِ آرام کو اُس کا فرماں روا قرار دیا ہے۔ پھر فریب کو جاسوس اور سینہ زوری کو شیطان اور لوٹ مار کو اُس کی ذریات قرار دے کر ملکِ فراغ کا خلل پذیر ہونا اور غرور و خود پسندی و حسد کا دخل پانا اور احتیاج کی گرم بازاری اور قحط و وبا کے صدمے اور ملکِ فراغ کے انتظام میں ایک نئی اصلاح کی ضرورت بیان کی ہے۔ پھر دو تجربہ کاروں یعنی تدبیر اور مشورے کی صلاح سے اہلِ عالم کا محنت پسند خرد مند کے پاس جانا اور اُس کے حکم سے بہ سرکردگیِ ہمت و تحمل جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لینی اور تحصیل معاش میں سرگرم ہونا اور دنیا میں تمدن کی بنیاد پڑنی بیان کی ہے۔ پھر افراطِ محنت کے مضر نتیجے ویسی ہی محسوسات کی تمثیلوں میں لکھ کر انجام کو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا میں جب تک آرام اور محنت دونوں اعتدال کے ساتھ نہیں رہتے، تب تک صحت، خوشی اور جرأت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس مضمون کا اسلوب بیان ہماری زبان کے قدیم اسلوبوں سے بہت کم ملتا ہے۔ اس میں معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور انسانی خصلتوں کے نیچرل خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایوں میں بیان کیے ہیں جن سے ہمارا لٹریچر بے شک خالی ہے۔ محنت و آرام میں اعتدال اور بے اعتدالی کے اچھے اور برے نتیجے اور آرام کے لیے محنت کی اور محنت کے لیے آرام کی ضرورت جس طرح پر کہ واقعے میں ہے، اس مضمون کو پڑھ کر اس کی

صورت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اسی اسلوب پر اور تمام مضامین لکھے ہیں جن کے دیکھنے اور غور کرنے سے مغربی شاعرانہ خیالات کی بلندی اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا علم انشا آیندہ کہاں تک ترقی کرے گا اور مغربی خیالات کے فوٹو ہماری زبان میں کس درجے تک خوبی کے ساتھ کھینچے جائیں گے، مگر ہمارے ملک کی موجودہ حالت میں نیرنگ خیال ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر میری رائے غلط نہیں تو زمانۂ آیندہ میں اس کی قدر ہی نہیں بلکہ پیروی بھی کی جائے گی۔ اگرچہ اس وقت اہل وطن کے محدود خیالات اور ادھورے مذاق اور ناتجربہ کار آنکھ سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ مصنف کی کوشش کا پورا پورا اندازہ کر سکیں۔ وہ اُن دو کپڑوں کو، جن میں سے ایک کل کے ذریعے سے اور دوسرا دست و بازو کی محنت سے تیار ہوا ہو، ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُن دو آموں کے پھل میں، جن میں سے ایک نے گرم سیر ملک اور دوسرے نے سرد سیر ملک میں نشو و نما پائی ہو، ایک ہی مزا ڈھونڈتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص ایک ایسی وسیع اور علمی، شائستہ اور باقاعدہ زبان سے، جیسے کہ انگریزی ہے، شاعرانہ خیالات کو لے کر ایک ایسی محدود اور بےقاعدہ اور ناکامل اور غیرعلمی زبان میں، جیسی کہ اُردو ہے، ادا کرتا ہے، اُس کی مشکلات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو واقعی اُس کا ہمدرد ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

اگرچہ اس عام قاعدے کے موافق کہ ''الصفو و الکدر توأمان'' انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا، خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام، جس کا بے عیب ہونا

محال ہے ، لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو ، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے ۔ شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانۂ حال کی عمدہ تصنیفات پر اسی طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی کی تصنیفات پر کی جاتی ہے ۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا ، کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالاتِ اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے اور کیا باعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ، ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا ۔ پس اب ہماری یہ دعا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی چھپ کر شائع ہو جائے اور ہمارے لٹریچر کی ترقی کے لیے یہ کتاب ایک مبارک فال ہو ! آمین ۔

۴

آبِ حیات

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، فائل ۱۸۸۱ع ، صفحہ ۹۳)

”آب حیات“ اُردو شاعروں کا وہ بے مثل تذکرہ ہے جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے بڑی تلاش اور کاوش کے بعد مرتب کیا ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ع میں شائع ہوئی اور اُس کے بعد سے اس وقت تک بیسیوں دفعہ چھپ چکی ہے ۔ یہ کتاب پُر لطف طرزِ بیان اور دلآویز طرزِ کلام اور نہایت درجہ فصیح و بلیغ عبارت کے لحاظ سے اُردو لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ کتاب کا اسلوبِ نگارش اتنا پیارا اور دل کش ہے کہ کتاب کو کہیں سے بھی کھول کر دیکھیں آدمی اُس کے مطالعے میں محو ہو کر رہ جاتا ہے ۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس میں واقعات کی اتنی موٹی موٹی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ؛ مثلاً وہ مقدمۂ کتاب میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے میرے والد (مولوی محمد باقر) نے دہلی سے ۱۸۳۶ع میں اخبار نکالا جس کا نام دہلی اردو گزٹ رکھا ۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے ۔ (دیکھیے بصائر کراچی کے سلطان ٹیپو نمبر میں مضمون ”اُردو کا سب سے پہلا اخبار“) پھر شعراء کے حالات و واقعات لکھنے میں بھی

بعض غلطیاں مولانا آزاد سے ہو گئی ہیں ۔ اس موقع پر ایک خاص بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے ، جس کی طرف مجھے علامہ برجموہن کیفی دہلوی اور برعظیم کے مشہور ادیب مالک رام صاحب نے بھی توجہ دلائی تھی ، اور وہ یہ کہ جب پہلی مرتبہ آب حیات شائع ہوئی تو اُس میں ”مومن“ کے حالات نہیں تھے جس کا کافی چرچا ہوا اور لوگوں نے طرح طرح کے اعتراض کرنے شروع کیے ۔ اس پر آزاد نے مولانا حالی کو لکھا کہ کتاب کی تالیف کے وقت مجھے مومن کے حالات دستیاب نہیں ہوئے ، اس لیے میں وہ نہیں لکھ سکا ۔ کسی بد نیتی یا تعصب کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا ۔ آپ اگر مومن کے حالات تلاش کرکے مجھے بھیج دیں تو نہایت عنایت ہوگی ۔ مولانا حالی نے فوراً حالات لکھ کر بھیج دیے ۔ آزاد نے وہ حالات آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیے ۔ مگر اس امر کا اعتراف نہ کیا کہ یہ حالات مولانا حالی کے فراہم کردہ اور تحریر کردہ ہیں ، اور اشارتاً یہ لکھ دیا کہ ایک صاحب کی مہربانی اور الطاف کی بہ دولت یہ حالات مہیا ہوئے ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں شامل کیے جا رہے ہیں ۔ اس عبارت میں لفظ ”الطاف“ مولانا کے نام ”الطاف حسین“ کی طرف ایک لطیف اور ذو معنی اشارہ ہے ۔

ان بعض باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب بہ حیثیت مجموعی نہایت قابل قدر اور بہت ہی دلچسپ ہے ۔

(محمد اسماعیل)

ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعے سے مستفید ہونے کا موقع اُس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردو اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے اور اس کے مضامین اور ابواب کی تفصیل ان میں درج ہو چکی تھی ۔ پس اب کوئی محل اس بات کا باقی نہ تھا کہ اس کی نسبت کچھ زیادہ لکھا جائے ۔ مگر جو خاص کیفیت اس کے دیکھنے سے ہمارے دل پر طاری ہوئی ہے ، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے ہم وطنوں پر بھی ظاہر کریں ۔ اس تذکرے کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ۔ حق یہ ہے کہ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کیے گئے ہیں ۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ شعرا کے نہایت ضروری حالات کے تجسس میں بھی کبھی کوشش نہیں کی گئی ، یہاں تک کہ تاریخ ولادت ، تاریخ وفات ، مولد ، مسکن ، قوم ، خاندان ، تعلیم ، مشورۂ سخن وغیرہ کا بھی بہت کم ذکر کیا گیا ہے ۔ بلکہ تمام ہمت اس بات میں صرف کی گئی ہے کہ ان کا کلام جس قدر اپنے مذاق کے موافق پایا ، انتخاب کرکے لکھ دیا اور ان کی بے معنی اور لغو ستائش میں ، جس سے کلام اور صاحبِ کلام کی اصل حقیقت پر اور پردے پڑ جائیں ، ورق کے ورق سیاہ کر دیے ۔ مصنف نے شعرا کے اُن ضروری حالات لکھنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ چند شخصوں کے سوا جن کے نشانِ قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پروائی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں ، ہر شاعر کے سوانح ، جہاں تک ممکن تھا ، نہایت تفصیل سے لکھے ہیں ۔ اُس نے ان کی تعریف میں وہ شاعرانہ مبالغے بھی نہیں کیے جن کا کچھ ثبوت نہ ہو بلکہ خود ان کے وقائع ایسے لکھے ہیں جن سے ان کی سیرت اور اخلاق پر استدلال ہو سکے ۔ اُس نے اُن کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور جا بجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے ، مگر ادب اور تہذیب کو

کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہایت خوبی کے ساتھ اس دشوار گزار مرحلے کو طے کیا ہے۔ وہ تاریخ اردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے بھائی مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔ مصنف نے اس تذکرے کے اول میں دو مضمون زبانِ اردو اور نظمِ اردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اردو سے متعلق ہے، اس نے انگریزی مؤرخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کرکے مدد لی ہے، اور پچھلا بڑا حصہ جو اردو، بھاشا، عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے، وہ خاص مصنف کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور زبان کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں کوئی ضروری بات فروگذاشت ہو گئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جو شخص سب سے اول کوئی تاریخی مضمون لکھتا ہے اس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں اور ممکن نہیں کہ کوئی ضروری چیز فروگذاشت نہ ہو جائے۔ لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچہ "تہذیب الاخلاق" کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس پرچے نے اردو زبان کو چند روز میں اس درجے تک پہنچا دیا ہے جو کم سے کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اردو لٹریچر پر اس پرچے کا بہت بڑا احسان ہے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجے کے مضامین اس پرچے میں لکھے گئے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر طور پر بیان کرنا اسی پرچے نے لوگوں کو سکھایا ہے اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا۔ نظم اردو کی تاریخ کا مضمون بھی جس کو پہلے مضمون کا ضمیمہ کہنا چاہیے، نہایت عمدہ ہے۔ اس کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ اس میں نیچرل شاعری کا ذکر، جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی، قلم انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں مصنف کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مصنف سے ہوئی ہے، اس کا جتانا مصنف کے معاصرین کا حق ہے، نہ کہ خود مصنف کا۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیس اور میرزا دبیر کو خاتمۂ شعرائے اردو لکھا ہے، یہ اس نے ایک نہایت انصاف کی بات لکھی ہے، بلکہ میر انیس کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو میر انیس ہی پر ہو سکتا ہے۔ میر انیس پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ ان سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہیے، کیوں کہ اُن کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں" شاید اُس زمانے میں مشہور ہوئی ہوگی جبکہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا اور غزل اور مثنوی معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس برس پہلے علوم قدیمہ کے سامنے علوم جدیدہ ہیچ و پوچ سمجھے جاتے تھے، لیکن اب روز بروز خیالات دگرگوں ہوتے جاتے ہیں۔ نظم اردو میں نیچرل شاعری کا پتا اگر ملتا ہے تو میر انیس ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ولی سے لے کر غالب تک شعرائے اردو کے پانچ طبقے کیے ہیں اور ہر ایک طبقے کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اُس کے نزدیک مستند تھے) انتخاب کر لیے ہیں، اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا

گیا ہے جو اپنے طبقے میں مستند سمجھا جاتا تھا ، جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین خاں ممنون ، لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا ، بلکہ اُس نے ہر دورے میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لیے ہیں اور اس سے اُن تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورے میں زبان اُردو پر واقع ہوئے ہیں ۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اُردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محلِ اعتراض تھا ۔ شعرا کے ذکر میں مصنف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ابتدا سے اخیر تک ہر ایک دورے میں جو جو الفاظ متروک اور اُن کی جگہ جو جو الفاظ مستعمل ہوتے گئے ، وہ بھی بوجہ استیفا ذکر کیے جائیں اور شہادت کے لیے جابجا ہر ایک دورے کے شعرا کا کلام نقل کیا جائے ۔ یہ کوشش نہایت تحسین و آفریں کے لائق ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس میں کس قدر دقت اٹھانی پڑی ہوگی ۔ پھر جہاں جہاں معاصرین کو ایک دوسرے سے توارد ہوا ہے ، وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ ہر ایک کا طرز بیان ایک ہی مطلب کے ادا کرنے میں کیسا تھا ۔ اس نے اور تذکرہ نویسوں کی طرح غزلوں کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہر ایک شاعر کی سالم غزلیں لکھ دی ہیں تا کہ ناظرین اُس کے عام خیالات کا اندازہ کر سکیں ۔ حقیقت میں یہ بات ٹھیک نہیں تھی کہ تمام شعرا کے کلام میں سے صرف ایک خاص طرز اور خاص روش کے مضامین انتخاب کیے جائیں اور ہر شخص کو مثلاً میر اور مرزا کا ہم پایہ ظاہر کیا جائے ۔ لیکن ہمارے نزدیک عام خیالات ظاہر کرنے کے ساتھ (جیسا کہ مصنف نے کیا ہے) یہ بھی ضرور ہے کہ ہر ایک شاعر کے اعلیٰ درجے کے خیالات اور اچھوتے مضامین بھی دکھائے جائیں تاکہ اس کا مبلغ فکر اور رسائی طبیعت کا منتہا معلوم ہو اور اُس کے پُر کن اور پست خیالات بھی بطور نمونے کے ظاہر کیے جائیں تا کہ اُس کی طبیعت کے آتار چڑھاؤ کا حال اچھی طرح خاطر نشیں ہو جائے ۔ بظاہر اس تمام تذکرے میں ۲۳ شاعروں کا حال قلم‌بند اور اُن کا کلام نقل کیا گیا ہے ، لیکن تراجمِ شعرا کے ضمن میں جا بجا اُن کے معاصرین اور اُن کے ہم صحبتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہر موقع پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے ایزاد کیے ہیں اور تمام حالات کے فراہم کرنے میں جو محنت اور جان کاہی مصنف نے کی ہے اس کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے سنِ تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا اور وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اُس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا ۔ ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں اور صرف افواہِ خلائق پر جاری ہوں ، کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ۔ بہادر شاہ اول کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک کہ سلطنتِ مغلیہ کے عین تنزل کا زمانہ ہے ، تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں ۔ اس عبرت انگیز زمانے کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرے میں نظر آتی ہے ، صفحاتِ تاریخ اس سے معرا ہیں ۔ ان حالات کو زیادہ تر دہلی سے اور اس سے کسی قدر کم لکھنؤ سے تعلق ہے ۔ اکثر مقامات پر ان حالات کو پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے اور زمانۂ گزشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ اس کتاب کو مورخانہ نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قومی ترقی کا ابتدائی ہنگامہ قابل دید ہوتا ہے اُسی طرح قومی تنزل کا ابتدائی تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے ۔ عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں ۔ امیر زادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں ۔ بعضوں کا دل

دنیا سے سرد ہو جاتا ہے اور وہ لباسِ فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں ۔ جن فلک زدہ خاندانوں کو تلاش معاش میں رئیسوں اور دولت مندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں ، وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہیں ۔ ضرورت اور فلاکت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لیے تمام مکروہات کو گوارہ کیجیے مگر خاندانی غیرت ، جو ابھی طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی ، ناگوار باتوں پر تحمل نہیں کرنے دیتی ۔ اگر کہیں مقسوم سے قدم جم بھی جاتے ہیں تو اس کو قیام نہیں ہوتا ، جہاں کوئی بات طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں ، فوراً بگڑ جاتے ہیں اور پھر اُدھر رخ نہیں کرتے ۔ خاندان تباہ ہو چکے ہیں مگر خاندانی افتخار ایک ایک کے دماغ میں بھرا ہوا ہے ۔ شرفا کے قافلے جوق جوق دلی سے لکھنؤ کو چلے جاتے ہیں ۔ جن کے باپ دادا دربار شاہی کے رکن رکین تھے ، اُن کی اولاد بادل شاہ اور شاہ تسلیم کے تکیوں میں دھونی رمائے بیٹھی ہے ۔ جو عالی‌شان محلوں میں رہتے تھے وہ درختوں کے سایے میں پڑے اینڈ رہے ہیں ۔ جن لوگوں کا استقلال مہمات ملکی میں صرف ہوتا تھا اُن کی نسلوں کا استقلال اب خالی پھیکی وضع داریوں میں صرف ہوتا ہے ۔ میر صاحب با ایں‌ہمہ تقدس بی نورن کی چوکھٹ کو ایک دفعہ روز سلام کر آتے ہیں ۔ شاہ صاحب کا تکیہ ہے اور ہر روز سہ پہر کو شریف زادوں کا جمگھٹا ہے ۔ اُمرا کی سفلہ مزاجی سے اہل کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑی ہے ۔ وہ اپنا تمام علم و فضل اور ذہن و جودت اسی میں صرف کرتے ہیں ۔ اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو اس کتاب میں دیکھ کر بے انتہا عبرت ہوتی ہے اور نیرنگیِ روزگار کا ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے ۔ اگرچہ مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اُردو شاعری نے ہماری معاشرت ، ہمارے اخلاق ، ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا لیکن اُس نے شعرا کا حال ایسا

واشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اُس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی کہ وہ جس قدر آگے بڑھتی تھی اُسی قدر منزل مقصود سے دور ہوتی جاتی تھی ۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اُردو شاعری کا آغاز اور سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت سے شروع ہوتا ہے ۔ گویا اُس کا بیج ایسی زمین میں بویا گیا تھا جس میں زراعت کی قابلیت نہیں رہی تھی ۔ شاعری کی اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے ، کیونکہ شعرا کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں اُسی قدر اُن کے خیالات شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں ۔ اسی بنا پر زمانے کو عربی میں ”افصح المودبین“ اور انگریزی میں ”گریٹ رفارمر“ کہا گیا ہے ۔ دوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارور کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے ۔ جس ملک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں تو شاعری کی اصلی ترقی نا ممکن ہوتی ہے ۔ مگر شخصی سلطنت سے بھی اس کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے ۔ شعرا کو ایک خاص جماعت کے مذاق کے موافق جو کہ دربار شاہی کے رکن رکین اور اپنے زمانے کے علم و فضل و لیاقت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں ، اپنے خیالات کی تہذیب اور اصلاح کرنی پڑتی ہے ۔ چنانچہ اکبری دورے کی شاعری اس کی مصداق ہے ۔ افسوس ہے کہ اُردو شاعری نے اُس وقت جنم لیا جب کہ اُس کا کوئی مربی اور سرپرست نظر نہ آتا تھا ۔ وہ دربار جو اُردو زبان کا ملجا و ماویٰ تھا ، برخاست ہو چکا تھا ۔ عام شائستگی و تعلیم ، جو ملک میں پہلے ہی سے نہ تھی ؛ امرا میں بہت سے بگڑ چکے تھے اور جو کچھ باقی تھے اُن کے مذاق افراطِ عیش و عشرت کے سبب فاسد ہو گئے تھے ۔ خواص کا گروہ جس سے اہل علم و فضل کی جماعت مراد ہے ، اپنی بے اقتداری سے اس قابل نہ تھا کہ

شاعری کی بنیاد محض ان کے مذاق پر رکھی جاتی ۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو شعرا کے خیالات کو تہذیب و شائستگی کی طرف کھینچتی ۔ بلکہ دائیں بائیں تمام اسباب ایسے جمع تھے جو شاعروں کو بھاٹ اور مسخرہ بنانے والے اور یا مرض مالیخولیا میں مبتلا کرنے والے یا باہمی رشک و حسد کے باعث تھے ۔ شعرا کو جن امیروں کے ہاں تعلق ہوتا تھا وہ یا تو علم و فضل اور مذاق سخن سے عاری یا عیش و نشاط میں منہمک ہوتے تھے اور اس لیے اُن کو سنجیدہ خیالات کبھی پسند نہ آتے تھے ، بلکہ ہنسی اور چہل کی باتوں پر ہر طرف سے قرار واقعی داد ملتی تھی ۔ ایسا ہی حال مشاعروں کا تھا کہ وہاں بھی فحش اور بے حیائی یا کسی کی ہجو پر جس قدر تحسین و آفرین کا غل ہوتا تھا ، اُس کا عشر عشیر بھی ایک متین اور سنجیدہ کلام پر نہ ہوتا تھا ۔ پھر چونکہ شعرا کے قدر دانوں کا تحط تھا ، اگر کسی کو قسمت سے کوئی ٹھکانا مل جاتا تھا تو وہ اس کو ایک فوزِ عظیم جانتا اور دوسرے شاعر کا وہاں رنگ نہ جمنے دیتا تھا ۔ اسی بنا پر شاعروں میں باہم چشمکیں رہتی تھیں ۔ بھرے مشاعروں میں ایک دوسرے پر اعتراض کرتا تھا ، ایک دوسرے کی ہجو پڑھتا تھا ، ایک دوسرے کی داد نہ دیتا تھا ۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ بھری محفلوں میں حریفوں پر چوٹیں کرو ، قہقہے لگاؤ ، اور موقع نہ ملے تو رموز و کنایہ میں خاکہ اڑاؤ ۔ یہ بلا اس قدر پھیلی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا سوانگ بنا کر سرِ بازار نکلتا تھا ، جہاں اُس کے ننگ و ناموس کی بے حرمتی کی جاتی تھی ۔ اُس کی ہجو کے اشعار ڈنڈوں پر گائے جاتے تھے ۔ شعرا کے باہم رشک و حسد کا یہ حال تھا کہ جس شاگرد کو ہونہار جانتے تھے اور خاص و عام کو اُس کی طرف مائل دیکھتے تھے ، اس کے بتانے میں دریغ کرتے تھے اور اس کو غلط اصلاحیں دے کر سرِ مشاعرہ ذلیل کرنا چاہتے تھے ۔ چند شاعر جو اعلیٰ درجے کے قانع ، مستغنی اور خوددار تھے اور سنجیدگی جن کی جبلت میں پیدا کی گئی تھی ، وہ بھی کوئی ایسی انوکھی روش اختیار نہ کر سکتے تھے جو سراسر مذاق جمہور کے خلاف ہو ، جیسے میر تقی علیہ الرحمۃ کہ ان کا ایک شعر پڑھ کر بے اختیار منہ سے درود نکلتا ہے اور دوسرا شعر پڑھ کر نہایت شرم آتی ہے ۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری بگڑی اور خوب بگڑی اور اس کا اثر ہمارے اخلاق پر ایسا ہی ہوا جیسا ہوائے سمّی کا اثر صحتِ جسمانی پر ہوتا ہے ۔ اس مطلب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے ۔ اب ہم مصنف کی شکر گزاری پر اس ہذیان سرائی کو ختم کرتے ہیں ، جس نے اپنے بیش قیمت اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کرکے اہل وطن کے لیے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جو زبان کے محققوں کے لیے ہادی اور رہنما ہے ، سیر و اخبار کے شائقین کے واسطے ایک داستانِ عبرت انگیز ہے ، ظرافت پسندوں اور نوجوانوں کے لیے سامان خندہ و نشاط ہے اور اصحاب رائے کے لیے ایک مفصل روئداد ہے ، جس میں اردو شاعری کے فیصلے کے لیے کافی شہادتیں موجود ہیں ۔ اگرچہ وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ شائستہ ملکوں کی طرح ہر نئی تصنیف و تالیف پر ہمارے ہم‌وطن بھی اس طرح گریں جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی پر گرتا ہے لیکن عمدہ اور مفید تصانیف کا حق ہے کہ اہل وطن دل و جان سے ان پر متوجہ ہوں اور ان کی قدر کریں اور مصنفوں کے شکر گزار ہوں ۔

۵

منطق استقرائی

مولوی محمد حسین نامی ایک صاحب اخبار ’’انجمن پنجاب‘‘ کے ایڈیٹر اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ فلسفے اور منطق پر اُن کو بڑا عبور حاصل تھا۔ بہت سے ادق اور خشک مضامین پر اُنھوں نے نہایت کامیابی سے قلم اُٹھایا ہے۔ ’’منطق استقرائی‘‘ ان ہی مولوی صاحب کی کتاب ہے جس پر مولانا حالی نے ریویو کیا تھا۔ یہ ریویو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ فائل ۱۸۸۲ع کے صفحہ ۱۰۲۸ پر شائع ہوا تھا۔ (محمد اسماعیل)

اس رسالے کے مصنف قصبۂ مہم ضلع رہتک کے ایک بزرگ خاندان سے ہیں، جن میں سے مولوی سید رمضان صاحب کا نام مسلمانوں میں اب تک تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب پنجاب کے مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایم۔ اے کا درجہ حاصل کیا ہے۔ باوجودیکہ ان کو کالج چھوڑے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور دو بڑے بڑے کام، ایک اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و ریاضی کی تعلیم اور دوسرے اخبار انجمن پنجاب کی ایڈیٹری، اُن سے متعلق ہے، پھر بھی اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے کئی مفید کتابیں اُردو میں تالیف اور ترجمہ کی ہیں، جیسے رسالۂ علم سکون سیالات، رسالۂ علم ہیئت، رسالۂ سیاستِ مدن، رسالۂ اصول قانون، اور یہ رسالہ جو اس وقت ہمارے

پیش نظر ہے۔ ’’منطق استقرائی‘‘ کے متعلق اس رسالے سے پہلے کوئی تصنیف یا تالیف یا ترجمہ اُردو زبان میں چھپ کر شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ منطق استقرائی کا موجد لارڈ بیکن کو قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا لارڈ مکالے نے بیان کیا ہے، ارسطو نے بیکن سے دو ہزار برس پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ تحقیقات جدید اور نئے اصول دریافت کرنے کے لیے صرف منطق استقرائی ہی رہنما ہو سکتی ہے، اور اُسی نے منطق قیاسی کو، جس پر آج کل ہماری قوم کی فضیلت اور فلسفیت کا مدار ہے، محض بے ثمر اور عقیم بتایا تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ بیکن نے اُس کی سود مندی کو حد سے زیادہ بڑھا دیا، اور جس لا زوال دولت کی کان سے تمام دنیا غافل تھی اُس کی طرف سب کو متوجہ کر دیا۔ جس طرح آج تک منطق قیاسی کو سرمایۂ فضیلت و استعداد سمجھتے ہیں، اُسی طرح ایک زمانے میں، یعنی لارڈ بیکن کی رہنمائی سے پہلے، تمام یورپ میں یہی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اُسی بے بر اور بے ثمر منطق پر تمام اہل مغرب قانع تھے جس پر بالفعل مسلمان قانع ہیں۔ سوائے لفظی بحث و تکرار اور نکمی تدقیقات کے کوئی نتیجہ اُن کے علم و فضل کا نہ تھا۔ مذہب رومن کیتھلک اور فلسفے میں ویسا ہی رابطۂ اتحاد مستحکم تھا جیسا بالفعل اسلام اور ارسطو کی حکمت میں پایا جاتا ہے۔ مگر بیکن کی کتاب ’’نودم آرگینم‘‘ نے لوگوں کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور بجائے اس کے کہ ایک کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک ایک دائرۂ معین سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے، اب ترقی کی سیدھی اور غیر محدود سڑک پر پڑ لیے۔ یورپ کے تمام صنائع و فنون اور تمام تحقیقات اور انکشاف کی کنجی یہی منطق استقرائی ہے جس کی تشریح و تحلیل ’’نودم آرگینم‘‘ میں کی گئی ہے، اور جس کا انکشاف ہندوستانیوں کے لیے سب سے پہلے مولوی محمد حسین

ایم ۔ اے کے ہاتھ اور قلم پر محول تھا ۔ یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اشیا اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں ۔ پس ہمارے ہم وطنوں کے سامنے منطقِ قیاسی کی توہین اور تنقیص اُس وقت تک کارآمد نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ منطق استقرائی کا کوئی عمدہ نمونہ اُن کے سامنے پیش نہ کیا جاتا ۔ ہم کو مصنفِ ممدوح کا شکریہ دل و جان سے ادا کرنا چاہیے جنھوں نے یہ نمونہ اہل وطن کے لیے مہیا کیا اور اُن کو دونوں منطقوں کے مقابلہ کرنے کا موقع دیا ہے ۔ کاش ہمارے ملک کے فضلا بھی اس گراں قدر کتاب پر ویسے ہی توجہ مبذول فرمائیں جیسے اہل یورپ نے ”نودم آرگینم“ پر کی تھی ۔ اس رسالے پر تھوڑی سی توجہ کرنے سے کم از کم یہ بات ضرور اُن کے ذہن نشین ہو جائے گی کہ جس درخت کو وہ ایک ہزار برس سے پانی دے رہے ہیں ، اُس سے نہ کبھی کسی نے پھل حاصل کیا ہے اور نہ اُس کے پھل لانے کی آیندہ توقع ہے ۔ وہ جس قدر زیادہ پھیلے گا اُسی قدر اُس کی ٹہنیاں زیادہ خاردار ہوتی جائیں گی ، اور جس قدر اُس کے ریشے زمین میں دوڑیں گے ، اُسی قدر زمین کو خراب اور برباد کریں گے ۔ اگرچہ اس رسالے کی بنیاد غالباً کسی خاص انگریزی کتاب پر رکھی گئی ہے اور زیادہ تر کسی ایک ہی کتاب کے مطالب اس میں ترجمہ کیے گئے ہیں ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مترجمِ موصوف نے بعض مفید باتیں اور کتابوں سے بھی اخذ کی ہیں ۔ اس کا اِردو ترجمہ جہاں تک کہ علمی مضامین کے بیان میں آسانی اور سہولت ہو سکتی ہے ، بہت صاف اور سلیس ہے ۔ اگرچہ اس کے مطالب سمجھنے میں مستعد طالب علموں کو بھی کسی نہ کسی قدر تامل اور غور کرنے کی ضرورت ہوگی ، لیکن علمی مسائل کا بیان اس سے زیادہ سہل اور آسان ہونا نہایت دشوار ہے ۔ ہندوستان کے انصاف پسند فاضلوں کا اتفاق ہے کہ

جس طرح تمام یورپ میں ہر علم کی اصطلاحیں خاص لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں ، اسی طرح ایشیا میں بھی کوئی خاص زبان ایسی ہونی چاہیے جس کی اصطلاحیں مشرق کی تمام علمی کتابوں میں داخل کی جائیں ۔ مشرق زبانوں میں صرف دو زبانیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ غرض پوری ہو سکتی ہے : ایک سنسکرت اور دوسری عربی ۔ لیکن سنسکرت کا جاری ہونا عرب ، شام ، ایران ، ترکستان اور افغانستان وغیرہ میں قریب محال کے ہے ، اور نیز علوم جدیدہ کی نئی اصطلاحیں بالفعل سنسکرت میں موجود نہیں ہیں ۔ البتہ عربی زبان ایسی ہے جس کی اصطلاحیں ایشیا کے اکثر حصوں میں جاری ہو سکتی ہیں اور نیز علوم جدیدہ کی بے شمار اصطلاحیں عربی میں وضع ہو چکی ہیں ۔ اسی واسطے مصنف نے اس رسالے میں عربی اصطلاحیں ، جو کہ مصر کے عربی ترجموں میں برتی گئی ہیں ، استعمال کی ہیں ۔ اگرچہ وہ سر دست کسی قدر اجنبی معلوم ہوں گی لیکن یقین ہے کہ بہت جلد وہ اُردو زبان میں گھل مل کر ہمارے ہم وطنوں کے کانوں سے مانوس ہو جائیں گی ۔

۶

رسالۂ منتہی العروض
اور
مثنوی تحفۃ الشعراء

یہ دو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں جو ۱۸۸۳ع میں دہلی سے شائع ہوئے تھے ۔ دونوں رسالوں کا مجموعی حجم ۸۶ صفحات تھا ۔ ان کا موضوع شعر گوئی کے شائق اصحاب کی رہنمائی تھا اور ان میں فن عروض کی بہت آسان اور سلیس زبان میں تعلیم دی گئی تھی ۔ کتاب چھپنے سے پہلے مولانا حالی کو دکھلا کر اُن سے ریویو کی چند سطریں لکھوائی گئی تھیں جو کتاب کے صفحہ ۳ و ۴ پر شائع ہوئی ہیں ۔ یہ کتاب حضرت میر محمد صاحب مرحوم خطیب جامع مسجد دہلی کے فرزند ارجمند سید محمود کی تالیف تھی ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مولانا حالی کی لائبریری میں موجود تھا جہاں سے یہ ریویو نقل کیا گیا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

میں نے یہ مفید رسالہ بقدر ضرورت ، اور مثنوی تمام و کمال دیکھی اور پڑھی ۔ فارسی میں اس فن کی متعدد کتابیں متداول ہیں جن میں سے بعض کو تمام اہل صناعت نے تسلیم کیا ہے ۔ مگر بظاہر کوئی اُردو کا جامع رسالہ خصوصاً پنجاب میں آج تک ایسا شائع نہیں ہوا جو عروض کی تمام ضروریات کو حاوی ہو ، یا ایسے ضبط و انتظام کے ساتھ لکھا گیا ہو جس سے اس فن کے وحشی اور اجنبی مسائل مستحضر کرنے میں طالب علم کو مدد ملے ۔

جہاں تک رسالۂ منتہی العروض کو میں نے دیکھا ہے ، میرے نزدیک وہ اکثر اعتبارات سے ان دونوں تعریفوں کا مستحق ہے ۔ ظاہرا اس رسالے میں عروض کی کوئی ضروری بات فروگذاشت نہیں ہوئی ۔ اور زحافات کا بیان ، جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی پورا پورا بیان نہیں ہوا ، اس رسالے میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے ۔ پھر زحافات کا باب ، جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے ، اس رسالے میں ایسا نہیں ہے ، بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں میرے نزدیک ضرور مدد دے گا ۔

مثنوی کی نسبت صرف یہ کہنا کافی ہے کہ نظم میں عروض یا کسی اور فن کا بیان کرنا جس قدر دشوار ہے وہ سب پر ظاہر ہے ۔ باوجود اس کے مصنف نے بہت صفائی اور بے تکلفی سے عروضی مباحث اس میں بیان کیے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ اس صاف و شفاف نظم کے ذریعے سے طلبہ کو عروض کی ضروری باتیں بآسانی یاد ہو سکیں گی ۔

۷

فرہنگ آصفیہ

فرہنگ آصفیہ کا کام مولوی سید احمد دہلوی نے ۱۸۶۸ع سے شروع کیا اور ۲۴ سال کی لگاتار محنت و کاوش کے بعد ۱۸۹۲ع میں تکمیل تک پہنچایا ۔ اس کی تالیف پر نظام دکن نے مصنف کو پانچ ہزار اور گورنمنٹ پنجاب نے پانچ سو روپیہ انعام دیا اور ایک ہزار روپے کی کتابیں خریدیں ۔ نظام نے پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور چار سو جلدوں کی خریداری کا وعدہ کیا ۔ ابھی یہ کتاب چھپی نہیں تھی کہ مولف نے مولانا حالی سے اس پر ریویو لکھنے کی فرمائش کی ۔ مولانا نے ۱۸۸۷ع کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں صفحہ ۵۹۴ پر ریویو لکھا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے ۔

(محمد اسماعیل)

یہ کتاب مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اہلِ وطن کے فائدے کے لیے تیار کی ہے جس کی نسبت قوی امید ہے کہ چند مہینے میں ختم ہو کر اطرافِ ہندوستان میں شائع ہو جائے گی ۔ اردو زبان کی ایسی ڈکشنریاں تو کئی لکھی جا چکی تھیں جن میں لغات کی تفسیر انگریزی زبان میں کی گئی ہے ، مگر یہ ڈکشنریاں ، جیسا کہ ظاہر ہے ، عام ہندوستانیوں کے لیے کچھ مفید نہ تھیں ۔ اُن سے صرف وہی معدود ہندوستانی فائدہ اٹھا سکتے تھے جو انگریزی زبان سے

واقف ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ تمام ڈکشنریاں جیسی کہ اردوے معلی کے تمام الفاظ پر حاوی نہ تھیں ، اسی طرح اردو زبان کے فصیح اور غیر فصیح دونوں طرح کے الفاظ بلا امتیاز اُن میں جمع کر دیے گئے تھے ۔ ہمارے ہم وطنوں کو خوش ہونا چاہیے اور مصنف کا تہہ دل سے ممنون ہونا چاہیے کہ اُس نے اپنے آرام و راحت سے دست بردار ہو کر اور سال ہا سال محنت و مشقت اُٹھا کر اُن کے فائدے کے لیے ایک ایسی زبان کا ذخیرہ مہیا کیا ہے جو باوجود اس کے کہ ہندوستان کی عام زبان سمجھی جاتی ہے اور ملک کی عام تصنیف و تالیف ، نثر و نظم اور دفاتر و اخبارات وغیرہ کی تحریرات کا مدار بالکل اسی پر ہے ، با ایں ہمہ آج تک تمام ہندوستان میں اس کا شیوع جیسا چاہیے نہیں ہوا ۔ اطراف ہندوستان کے وہ لوگ بھی جو فی الواقعہ ضروری تقریر و تحریر پر قدرت رکھتے ہیں ، اگر میری رائے غلط نہیں تو اس ڈکشنری میں آدھے سے زیادہ ایسے الفاظ پائیں گے جن سے وہ پہلے واقف نہ تھے ۔

شیخ ابو الفیض فیضیؔ نے جب تفسیر ''سواطع الالہام'' لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو لغت عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ عربی لغات کی کتابیں خریدا کرتا تھا ۔ ایک بار اُس نے کئی ہزار روپے کی کتابیں اسی غرض سے خریدیں اور جب ان کو اول سے آخر تک دیکھ چکا تو ایک روز مجلس میں کسی نے شیخ سے ان کتابوں کا حال پوچھا ۔ اُس نے کہا الحمد للہ جو حقیر رقم میں نے ان کتابوں کے خریدنے میں صرف کی تھی اُس سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا ۔ میں نے دو لغت ان کتابوں میں ایسے پائے جو پہلے میری نظر سے نہ گزرے تھے ۔ چوں کہ اس ڈکشنری میں قطعاً اور یقیناً اردو کے ہزاروں ٹکسالی اور مستند الفاظ ایسے موجود ہیں جو اکثر ہندوستانیوں کے حق میں بالکل نئے اور اجنبی ہوں گے اس لیے

جو قدر فیضی نے اُن کتابوں کی کی تھی ، اُس سے بہت زیادہ ہم کو اس ڈکشنری کی قدر کرنی چاہیے ۔

ہندوستان میں جب سے کہ اُردو تحریر کا زیادہ رواج ہوا ہے ، وقتاً فوقتاً اُردو ڈکشنری کی ترتیب کے لیے جا بجا تدبیریں ہوتی رہی ہیں ۔ ایک زمانے میں سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے بھی ایک نمونہ اُردو ڈکشنری کا چھاپ کر شائع کیا جو فی الواقعہ بہت سلیقے کے ساتھ لکھا تھا ۔ لیکن جس حد تک کہ مصنف نے اس کام کو پہنچایا ہے ، آج تک کسی نے نہیں پہنچایا ۔

اُردو ڈکشنری لکھنے کے لیے دو نہایت ضروری شرطیں تھیں : ایک یہ کہ اُس کا لکھنے والا کسی ایسے شہر کا باشندہ ہو جہاں کی زبان تمام ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہو ، اور ایسے ہندوستان میں صرف دو شہر مانے گئے ہیں : دلی اور لکھنؤ ۔ مگر میں دلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتا ہوں ۔ اگرچہ اُردو زبان کا وہ حصہ جس کو زیادہ تر خواص استعمال کرتے ہیں ، دہلی و لکھنؤ میں چنداں تفاوت نہیں رکھتا ، لیکن عوام کی زبان جس سے اہل حرفہ و اہل بازار کے محاورات و اصطلاحات مراد ہیں اور جو زبان کا بہت بڑا حصہ اور آج ڈکشنری کا جزو اعظم ہے ، وہ دہلی میں بہ نسبت لکھنؤ کے زیادہ مستند سمجھے جانے کے لائق ہے ۔ شاہان اودھ کے مورث اعلیٰ کے ساتھ جو خاندان دہلی سے بگڑ کر لکھنؤ گئے تھے ، وہ اکثر دہلی کے امرا و شرفا کے خاندان تھے جن کے اعقاب و اخلاف آصف الدولہ بلکہ سعادت علی خاں کے زمانے تک تمام دربار پر حاوی رہے ۔ اس لیے اعلیٰ طبقے میں انھی کی زبان جاری ہوئی ۔ لیکن دہلی کے ادنیٰ طبقوں میں سے اگر کچھ لوگ وہاں گئے بھی ہوں تو اُن کی تعداد اس قدر ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اُن کی زبان لکھنؤ کے تمام عوام الناس کی زبان پر غالب آ جائے ۔ اس لیے

ضرور ہے کہ لکھنؤ کے ادنیٰ طبقوں کی زبان اُس زبان سے مغایر ہو جو دہلی کے انھی طبقوں میں متداول تھی ۔ پس ہمارے نزدیک صرف دلی ہی کی زبان ایسی ہے جس پر اُردو ڈکشنری کی بنیاد رکھی جائے ۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو کیوں کہ خود دہلی میں بھی فصیح اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے ۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اُردوے معلّی کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی ۔ کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آیندہ ڈکشنریوں کی نیو رکھی جائے گی ، ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں دونوں ضروری شرطیں موجود ہیں ۔

جانسن نے ۱۷۵۵ ع میں جب انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اُس نے ایک دولت مند امیر کو اپنی ڈکشنری کا پیٹرن بنانا چاہا تھا تا کہ اُس کی مدد سے اپنی کتاب چھپوا سکے ، مگر اُس نے پیٹرن بننا منظور نہیں کیا ۔ آخر محض اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے عام قبولیت کی اُمید پر اُس نے اپنا کام شروع کیا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کو انتہا تک پہنچایا اور تمام قوم سے اپنی محنت کی داد لی ۔ گو اس کے بعد ویبسٹر اور اوگلویز جیسی نہایت عمدہ عمدہ ڈکشنریاں لکھی گئیں جن سے جانسن کی ڈکشنری کو اب کچھ نسبت نہیں رہی ، لیکن جب تک انگلستان اور انگلستان کی زبان زمین کے پردے پر موجود ہے ہمیشہ جانسن کا نام سب سے اول نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا ۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ اُردو ڈکشنری بھی ہندوستان میں وہی وقعت حاصل کرے جو اول جانسن کی ڈکشنری نے انگلستان میں حاصل کی تھی ۔ کیوں کہ اُردو ڈکشنری کے جامع

نے بھی ہمت، استقلال، محنت اور سلف ہلپ کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی کام کیا ہے جیسا جانسن نے کیا تھا۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آردو ڈکشنری میں کچھ باتیں گرفت کے قابل نکلیں، لیکن ایسی باتوں سے اوچھے نکتہ چینوں کی طرح تمام کتاب کو موردِ طعن ٹھہرانا یا مصنف کا احسان نہ ماننا سخت بے انصافی ہوگی۔ آدمی بالطبع اپنی بزرگی اور تفوق ثابت کرنے کا شائق ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔ جو لوگ کچھ کام نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے، وہ اکثر اوروں کے کام میں عیب نکال کر نہ صرف لوگوں کی نظر میں اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہیں بلکہ خود بھی اپنے تئیں آن سے بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جو لوگ منصف مزاج ہیں اور تحقیق الفاظ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں، وہ آمید ہے کہ ہرگز ایسا خیال نہ کریں گے۔ اکثر اوقات صرف ایک لفظ کی تحقیق میں لوگوں سے کئی کئی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ جو شخص ایک مستقل اور وسیع زبان کے تمام الفاظ کی تحقیقات کرے وہ لغزش اور خطا سے محفوظ رہ سکے۔ ہر کام جب اول ہی اول کیا جاتا ہے تو اس میں بالضرور بہت سی باتیں فروگذاشت ہو جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً زمانہ آن کی اصلاح کرتا ہے۔ مگر پیشوائی کا منصب صرف آسی کام کے لیے ہے جو سب سے اول کیا گیا ہے۔

جوہری نے صحاح بیس برس میں مرتب کی تھی اور آس کے بعد مجدد الدین فیروز آبادی نے قاموس صرف تین برس میں لکھ لی۔ ایک منصف عالم کے سامنے صاحبِ قاموس کی نہایت تعریف کی گئی کہ آس نے قاموس جیسی کتاب تین برس میں مرتب کر لی۔ آس عالم نے کہا ”تین برس میں نہیں، ۲۳ برس میں لکھی ہے: ۲۰ برس جوہری کے بھی اس پر اضافہ کرنے چاہئیں۔

ہم کو آمید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس ڈکشنری کے بعد اس سے زیادہ جامع اور عمدہ ڈکشنریاں لکھنے کی کوشش کریں گے اور شاید وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوں، مگر اہل انصاف کے نزدیک تمام آیندہ ڈکشنریاں جو آردو زبان کی تکمیل کے لیے لکھی جائیں گی وہ سب اس ڈکشنری کی طفیلی ہوں گی۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آردو زبان کی متعدد ڈکشنریاں جو یورپین مصنفوں نے انگریزی زبان میں ترتیب دی ہیں (جیسے شیکسپیئر، فوربس اور فالن وغیرہ، جن میں سے فالن ڈکشنری تو خاص اسی مولف کی مصالح اور سات برس کی معاونت سے تیار ہوئی) ان سے اردو ڈکشنری کے جامع کو ضرور کسی نہ کسی قدر مدد ملی ہوگی۔ مگر اس سے اس کی وہ فضیلت، جو کسی کام میں تقدم کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے، زائل نہیں ہو سکتی۔ اول تو جو دقتیں ایک اورینٹل اسکالر کو انگریزی کتابوں سے مدد لینے میں برداشت کرنی پڑتی ہیں، وہ آن مشکلات سے شاید کچھ ہی کم ہوں گی جو کسی زبان کی پہلی ڈکشنری کے جامع کو پیش آتی ہیں۔ دوسرے تمام مذکورہ بالا انگریزی ڈکشنریوں کو اس ڈکشنری کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی بنیاد صرف انگریزی ڈکشنریوں ہی پر نہیں رکھی بلکہ بہت کچھ زیادت و نقصان و تغیر و تبدل اور دخل و تصرف جیسا کہ اہل زبان کو شایاں ہے، اپنے علم و رائے کے موافق کیا ہے، اور اسی لیے اس کی ڈکشنری میں بہ مقابلہ انگریزی ڈکشنریوں کے وہ تفاوت پایا جاتا ہے جو اہل زبان اور زبان والوں کی تحقیقات میں ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

ہم کو آمید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس اردو ڈکشنری کی ایسی ہی قدر کریں گے جیسے کہ حق شناسوں کو اپنے محسن کے احسان کی قدر کرنی چاہیے۔

۸

گلستان کا ناگری ترجمہ

گلستان سعدی کی عجیب و غریب مقبولیت اور ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اگرچہ خود ہندی اور ناگری میں قصوں اور کہانیوں کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے مگر گلستان کی روانی کو دیکھ کر ہندی والوں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا اور انھوں نے بھی اس کا صاف و سلیس ناگری میں ترجمہ کر ڈالا ۔ یہ ترجمہ سمت ۱۹۲۸ مطابق ۱۳۰۵ھ موافق ۱۸۸۸ع میں ہوا ۔ مترجم کا نام پنڈت مہر چند داس تھا اور کتاب رائے بھوانی داس کے مطبع میں بہ مقام دہلی چھپی تھی ۔ میں نے یہ کتاب مولانا حالی کی لائبریری میں دیکھی تھی ۔ بڑی تقطیع کے شاید دو سو صفحات ہوں گے ۔ کاغذ معمولی لگایا گیا تھا اور خود مترجم نے شائع کی تھی ۔ ہر صفحے میں دو کالم تھے ۔ داہنی طرف ناگری ترجمہ اور بائیں طرف اصل فارسی ۔ مولانا کا مندرجہ ذیل ریویو کتاب میں چھپا تھا ، جہاں سے لے کر میں ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں ۔

(محمد اسماعیل)

گلستان سعدی کے بے شمار ترجمے جو دنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک ہوئے ہیں ، ان میں سے اخیر ترجمہ ہمارے لائق اور ذی وقعت دوست پنڈت مہر چند داس صاحب جینی رئیس قصبہ سونی پت ضلع دہلی کا ہے ، جو کہ انھوں نے نہایت کوشش اور تندہی سے

فصیح اور سلیس ہندی بھاشا میں محض اہل وطن کے فائدے کے لیے قلم بند کیا ہے اور جس کو مترجم ممدوح کی اجازت سے رائے بھوانی پرشاد صاحب نے اپنے مطبع میں چھپوا کر شائع کرنا چاہا ہے ۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے میں بھی ، جو کہ خیالات کی نہایت درجہ ترقی کا زمانہ ہے اور جس نے اکثر قدما کی تصنیفات کو تقویمِ پارینہ کی طرح اہل عالم کی نظر سے گرا دیا ہے ، شیخ سعدی کی گلستان اس زمانے میں بھی اسی قدر مقبول ہے جیسے کہ ساڑھے چھ سو برس تک تمام دنیا میں مقبول رہی ہے ۔ یہ کتاب اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک مسلمان شخص ہے ، صرف مسلمانوں ہی میں مقبول نہیں ہے بلکہ ہر مذہب اور ہر ملت کے لوگ اس کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں ۔ یورپ کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں گلستان کا ترجمہ نہ ہوا ہو ۔ بعض زبانوں میں جیسے انگریزی ، فرانسیسی اور جرمن ہے ، آٹھ آٹھ دس دس ترجموں کی نوبت پہنچی ہے ۔ ترکی زبان میں خاندانِ سلطنت کے ایک رکنِ رکین نے قدیم ترجموں کے علاوہ ایک اور ترجمہ گلستان کا حال ہی میں مرتب کیا ہے ۔ پنڈت مہر چند داس صاحب کی کوشش زیادہ تر اس سبب سے قدر کے لائق ہے کہ انھوں نے زبان حال کے مصنفین اور مؤلفین کی طرح اس ترجمے سے کوئی فائدہ ملحوظ اور مدِ نظر نہیں رکھا ۔ جس طرح قدیم زمانے کے اہل علم اور ارباب تصنیف ابنائے جنس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے مفید کتابوں کی ترتیب میں اپنی عمریں صرف کرتے تھے ، اسی طرح پنڈت صاحب نے اس ترجمے کے سر انجام کرنے میں محض اس لیے جد و جہد کی ہے کہ جو لوگ فارسی خط اور اردو زبان کی نسبت ناگری خط اور ہندی بھاشا سے زیادہ مانوس ہیں ، وہ شیخ کے پاکیزہ اور لطیف خیالات سے پورا پورا لطف اٹھائیں ۔ لائق مترجم

نے اس ترجمے میں یہ التزام کیا ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں لکھا جائے اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال میں نہ لائے جائیں، اور جہاں تک ہو سکے ترجمے میں اصل کتاب کے الفاظ کی پابندی کی جائے، اور شیخ کا اسلوب بیان تا بمقدور اپنی حالت پر قائم رہے۔ نظم میں ہر بیت کا مضمون ایک ہی دوہرے میں ختم ہو جائے تا کہ ناظرین کو مصنف کا خیال سمجھنے کے لیے دوسرے دوہرے کا منتظر رہنا نہ پڑے۔ یہ تمام التزام جس قدر ضروری ہیں اس سے زیادہ دشوار ہیں۔ اور جب کہ مترجم کو بھی خیال ہو کہ زبان کی خوبی ہاتھ سے نہ جائے تو یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ پنڈت صاحب کی یہ کوشش ہم وطنوں کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگی اور یہ ترجمہ جس کی بنیاد محض نفع رسانی پر رکھی گئی ہے، ضرور مقبولِ خاص و عام ہوگا۔

۹

سیرة النعمان

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ فائل ۱۸۹۲ع، صفحہ ۵۶)

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی سب سے پہلی تصنیف ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' ہے جو آپ نے ۱۸۸۷ع میں لکھی۔ دوسری تصنیف المامون بھی ۱۸۸۷ع میں نکلی۔ مولانا کی تیسری تصنیف سیرة النعمان ہے۔ ۱۸۸۹ع میں اس کی بنیاد پڑی اور اخیر سال یعنی دسمبر ۱۸۸۹ع میں اس کا پہلا حصہ ختم کیا۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ جو نہایت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۰ع میں شروع ہوا اور اس سال کے آخر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ع میں وہ ختم ہوا۔ ۱۸۹۱ع کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی اور ۱۳ جنوری ۱۸۹۲ع کو مولانا شبلی کے پاس اعظم گڑھ میں پہنچ گئی۔

یہ ہے اس بے نظیر اور بے مثل کتاب کی ترتیب و تدوین اور اس کی طباعت و اشاعت کی مختصر تاریخ۔ یہ کتاب مولانا شبلی کی بہترین کتابوں میں سے ہے اور بہت سے ایڈیشن اس کے اب تک پاکستان و ہندوستان سے شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمة اللہ علیہ کی اس سے بہتر سوانح عمری عربی، فارسی اور اردو میں آج تک کسی نے نہیں لکھی۔

(محمد اسماعیل)

مولانا کی چند بیش بہا تصنیفیں اس سے پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں ، جیسے ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ ، ”مامون رشید کی سوانح عمری“ ”رسالۂ جزیہ“ ۔ انھوں نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے ، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوئی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ، میں سیرۃ النعمان کو ان سب میں سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں ۔ اگرچہ اس کتاب پر ریویو لکھنا ایک محدث ، فقیہ ، مورخ اور ممارسِ فنِ رجال کا کام ہے اور میں ان چاروں صفتوں سے مبرا ہوں ، لیکن ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص جو ریل کی حقیقت سے واقف نہ ہو مگر اس میں بیٹھ کر سفر کر چکا ہو ، وہ لوگوں کے سامنے ، جو اب تک ریل میں سوار نہیں ہوئے ، محض آسائش یا تکلیف کی کیفیت ، جو اس پر ریل کے سفر میں گزری ہو ، بیان کرے ۔ ریویو لکھنے میں ، بہ شرطیکہ وہ دیانت اور سچائی سے لکھا جائے ، اکثر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو ریویو نگار کی رائے کے موافق ہوتا ہے ، اس کی داد دی جاتی ہے اور جس قدر اس کی رائے کے خلاف ہوتا ہے ، وہ مصنف کی لغزش یا خطا پر محمول کیا جاتا ہے ۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مثلاً جو کتاب تسنن تا تشیع یا تقلید یا عدم تقلید کی تائید میں لکھی جائے ، اس پر مخالف مذہب کا آدمی کبھی عمدہ ریمارک نہ کر سکے ۔ یا جو مضمون ایک سکول کے فلسفے پر لکھا جائے ، ہرگز دوسرے سکول کا پیرو اس کی داد نہ دے سکے ۔ میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض ، جن کو زمانے کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈھتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو ، کس حد اور کس درجے تک ادا کیے ہیں ۔ پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں ، ہم کو

یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے ، کیوں کہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے ، نہ ریویو لکھنے والے کا ۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوانِ بیان کیسا ہے ؟ ترتیب کیسی ہے ؟ طریقِ استدلال مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں ؟ اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضاے وقت کے موافق ہونی چاہیے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے ، وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ میں اس ریویو میں صرف انھیں باتوں سے بحث کروں گا اور ہرگز ریویو نگاری کی حد سے متجاوز نہ ہوں گا ۔ ایک فاضل ادیب محقق (اور اگر وہ منظور کرے تو منشی اور شاعر بھی) جس کی متعدد تصنیفات مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں ، اس کی طرز عبارت اور طرز بیان پر گفتگو کرنی صرف ان اخبار نویسوں کا کام ہے جن کے پاس اپنے اخبار کے معمولی کالم پورے کرنے کے لیے کوئی مضمون سردست موجود نہ ہو اور وہ ناچار اس مقولے کے موافق کہ ”الغریق یتشبث بکل حشیش“ اسی بحث کو غنیمت سمجھیں ۔ یہ اس باب میں اس کے سوا کسی بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ، سمجھتا کہ سادگی اور بے ساختہ پن جو عموماً ہر تحریر کی جان اور خاص کر تاریخ و بیوگرفی کا ایمان ہے ، وہ اس مصنف کی ہر تصنیف میں ترقی پذیر ہیں ۔ جو اسٹائل انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ رائٹر اور ریڈر دونوں کے لیے رستہ روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہوتا جائے ۔ ترتیب کا مرحلہ خاص کر کسی مشہور بزرگ کی لائف میں ایسا سخت اور دشوار گزار ہے کہ مصنف بشرطیکہ وہ حق تصنیف سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو ، اس مرحلے میں تھک کر چور ہو جاتا ہے ۔ اگر اس بزرگ کی لائف کچھ لوگ پہلے لکھ چکے ہیں اور اب ایک نیا مصنف انھی کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے ، اس کو البتہ کچھ دشواری نہیں ہے ۔

لیکن اگر اس مشہور بزرگ کی لائف اب تک کسی نے نہیں لکھی یا لکھی ہے مگر یہ اخیر مصنف پہلی تصنیفات سے صرف واقعات اخذ کرتا ہے اور ترتیب میں کسی کی پیروی نہیں کرتا بلکہ اس کو اپنے مذاق کے موافق بدلنا چاہتا ہے ، اس کو نہایت سخت عقبات سے عبور کرنا پڑتا ہے ۔ وہ ابواب و فصول بالکل نئے ڈھنگ سے مقرر کرتا ہے اور بے شمار پراگندہ اور منتشر باتوں کو پہلے ان ابواب و فصول پر تقسیم کرتا ہے ، پھر ہر ایک باب اور ہر ایک فصل میں ان کو ترتیب وار بیان کرتا ہے ۔ ایک ہی بات کبھی اس کو اول لکھنی مناسب تر معلوم ہوتی ہے اور کبھی آخر اور بیچ میں ۔ سیرۃ النعمان کے مصنف کو شاید پہلے حصے کی ترتیب میں ، جو امام صاحب کے حالات زندگی پر مشتمل ہے ، ایک آدھ کتاب سے ، جو تصنیف کے وقت ان کے پاس موجود تھی ، کچھ مدد ملی ہو تو ملی ہو ، لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے طرزِ اجتہاد اور اصولِ استنباط سے بحث ہے ، اس کی ترتیب میں یقیناً ان کو اپنے مذاق اور سلیقے سے کام لینا پڑا ہے ۔ اور جہاں تک ہم دیکھتے ہیں دونوں حصوں میں حسنِ ترتیب کا حق پورا پورا ادا ہوا ہے ۔ فلسفے میں حسن کی تعریفیں مختلف طور پر کی گئی ہیں ، لیکن سب سے زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ حسن تناسبِ اعضا کا نام ہے ۔ پس جس طرح کسی حسین آدمی کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ اس کے اعضا متناسب ہیں ، اس کے کمالِ حسن و جمال کا اقرار کر لینا ہے ، اسی طرح کسی کتاب کی نسبت صرف یہ کہنا کہ اس کی ترتیب ٹھیک ہے ، گویا یہ مان لینا ہے کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے ۔ اس کتاب میں جو استدلال نقل و روایت سے کیا گیا ہے ، گو وہ مخالف پر حجت نہ ہو سکے لیکن موافقین کی تسلی کے لیے کافی و وافی ہے ۔ اور ایک ایسے سوال پر جس میں ہزار برس سے اختلافات چلے آتے ہیں ، ایسا استدلال جس کا مدار محض نقل و روایت پر ہو ، اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا ۔ رہا وہ استدلال جس میں قابلِ ادب مصنف نے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیا ہے ، اس کی نسبت کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ ایسے طریقۂ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے ۔ مصنف نے نہایت عمدگی سے بتایا ہے کہ کیوں کر امام صاحب اور ان کے اتباع کو اہل الرائے کہا گیا ؟ کس لیے انہوں نے مذہب میں قیاس کو کثرت سے دخل دیا ؟ روایتِ حدیث کے لیے کیوں ایسی شرطیں لگائیں جن سے حدیث کا دائرہ تنگ ہو جائے ؟ روایت کے اصول جو انہوں نے فن حدیث میں قائم کیے ، ان سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا ؟ فقہ کی حالت امام صاحب سے پہلے کیا تھی ؟ اور انہوں نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ؟ فقہ کی تدوین اور اس کو ایک جامع قانون کی حد تک پہنچانے کا خیال ان کو کیوں کر پیدا ہوا ؟ فقہ کی تدوین انہوں نے کس احتیاط کے ساتھ کی اور کیسے کیسے جلیل القدر لوگوں کو اس میں شریک کیا ۔ فقہ حنفی کو اس قدر حسنِ قبول کیوں حاصل ہوا ؟ کس لیے وہ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی اور باوجودیکہ امام صاحب میں مثل دیگر ائمۂ مجتہدین کے ذاتی خصوصیتیں نہ تھیں ، کیوں ان کی فقہ نے اس قدر رواج پایا ؟ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تشریعی اور غیر تشریعی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کیا ، ورنہ ان سے پہلے شارع کے تمام اقوال و افعال ، خواہ تبلیغِ رسالت کے متعلق ہوں اور خواہ دنیوی مصالح سے ، سب تشریعی سمجھے جاتے تھے ۔ انہوں نے بہت عمدگی سے یورپ کے بعض مورخوں کے اس شبہے کو کہ فقہِ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے ، رفع کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی کتابوں سے بہت کم

واقفیت حاصل کی ہے اور فقہِ حنفی کی تدوین تک کوئی ترجمہ یونانی وغیرہ سے نہیں ہوا ، چہ جائیکہ کسی قانونی کتاب کا ترجمہ جو آج تک ثابت نہیں ہے ۔ اُنھوں نے کمال لیاقت سے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے فقہِ حنفی کو تمام فقہوں پر ترجیح حاصل ہے ۔ مثلاً یہ کہ امام صاحب بخلاف اشاعرہ کے حسن و قبحِ اشیاء کو عقلی مانتے ہیں نہ شرعی ۔ یا یہ کہ فقہِ حنفی بہ نسبت تمام فقہوں کے زیادہ آسان ہے اور شریعت کا اصل مقصد جس کی بابت تصریح کی ہے کہ جیسا فقہِ حنفی سے حاصل ہوتا ہے اور کسی فقہ سے حاصل نہیں ہوتا ۔ اس بات کو مصنف نے ایسی خوبی و بسط کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ جس قدر کتابیں امام صاحب کے حالات میں پہلے لکھی جا چکی ہیں ، اس بات نے 'سیرۃ النعمان' کو اُن سے بہت بلند درجے پر پہنچا دیا ہے ۔ اس باب میں ایک ایسا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کافی ثبوت دینا آسان کام نہیں ہے ۔ با ایں ہمہ جہاں تک کہ ایک سرسری نظر سے رائے قائم ہو سکتی ہے ، اُس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے جتنی خصوصیتیں فقہِ حنفی کی جتائی ہیں. اُن کے ثبوت میں قابلِ اطمینان مثالیں پیش کی ہیں اور ان مثالوں کے بہم پہنچانے میں نہ صرف سعی و کوشش کا حق ادا کیا ہے بلکہ اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیے ہیں ۔ با ایں ہمہ جس طرح دریاے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب کی تکمیل کے لیے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے ۔ خاتمے میں مصنف نے منجملہ اُن چالیس بزرگوں کے جو امام صاحب کے ساتھ تدوینِ فقہ میں شریک تھے ، دس ممتاز شخصوں کا اور اُن کے علاوہ بعض اور ائمہ وقت کا ، جو حدیث و رجال میں امام کے شاگرد تھے ، تذکرہ لکھا ہے ۔

یہ خاتمہ بھی نہایت دلچسپ اور ایک ایسے ضروری مضمون پر مشتمل ہے جس کے بغیر امام صاحب کی سوانح عمری نا تمام رہتی ۔ اس کتاب کا خیال جس قدر کہ لفظ 'سیرۃ النعمان' سے دل میں پیدا ہوتا ہے ، بہ نسبت اس کے میرے ریویو سے شاید کچھ ہی زیادہ پیدا ہوگا ۔ پس جو لوگ اس کتاب کی اصل حقیقت اور مصنف کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کرنا چاہتے ہیں ، ان کا فرض ہے کہ اُس کو خود اول سے آخر تک دیکھیں ۔ اس کتاب سے صرف امام اعظم کی عظمت اور اُن کی فقہ کی جلالتِ شان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی خالص آب و ہوا انسان کے دل و دماغ پر کیا اثر رکھتی تھی ، اور جب تک یہ چشمہ اپنے منبع سے قریب رہا ، اُس سے علم و اخلاق کی کھیتیاں کیسی سرسبز و شاداب ہوتی تھیں ۔ امام صاحب کے حالات ، اُن کے اخلاق ، ان کا طریقۂ معاش ، اُن کی طرزِ معاشرت اور اُن کی مساعیٔ جمیلہ ، جو اُن سے اسلام کی خدمت میں بن آئیں ، بلا شبہ ایسی ہیں کہ مسلمان بلکہ خود اسلام اُن پر جس قدر فخر کرے بجا ہے ، اور ایسی ہیں کہ اُن کو ہمیشہ نصب العین رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہونا چاہیے ، کیونکہ وہ صرف دین ہی میں نہیں بلکہ دنیوی امور میں بھی بہت بڑی رہنما ہوں گی ۔ ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب ۔

۱۰

انوار الاخلاق

یہ ۳۵ جواب مضمونوں کی ایک کتاب تھی جو مولوی نور احمد صاحب نور نے مڈل اور ہائی سکولوں کے طلباء کے لیے لکھی تھی تاکہ اُنھیں پڑھ کر طلبا میں مضمون نویسی کی لیاقت پیدا ہو۔ یہ سارے مضامین تعلیمی، اخلاق اور معاشرتی تھے اور طلباء کی سمجھ اور لیاقت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے لیاقت اور قابلیت سے لکھے گئے تھے، اور اُس وقت کے لحاظ سے نہایت مقبول ہوئے تھے۔ محکمۂ تعلیم پنجاب نے اُنھیں سکولوں کے لیے منظور کر لیا اور پنجاب کے سکولوں میں ان کی خاص شہرت ہو گئی۔ مولانا حالی کا ریویو اس پر اُسی وقت کا ہے جب ۱۸۹۷ع میں اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا۔ بعد میں اس موضوع پر نئی نئی کتابیں نکل آنے کی وجہ سے اس کی وہ وقعت باقی نہ رہی جو شروع میں اُسے حاصل تھی، اور اب تو عام لوگوں کو شاید اس کا نام بھی معلوم نہ ہو۔

(محمد اسماعیل)

جتنے مضامین اس کتاب میں درج ہیں، میں نے اول سے آخر تک کچھ خود دیکھے اور اکثر پڑھوا کر سنے۔ مصنف کے طرز بیان سے جو ملک کی خیر خواہی اور طالب علموں کی ہمدردی

کا جوش ظاہر ہوتا ہے، وہ ہر وطن دوست کو ان مضمونوں کے اول سے آخر تک دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

مصنف کی اصل غرض ان مضامین کے لکھنے اور ترتیب دینے سے، جیسا کہ اُن کے عنوانِ بیان سے ظاہر ہے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ مڈل اور انٹرنس کے طالب علم، جن کو جواب مضمون میں امتحان دینا پڑتا ہے، اُن کے لیے ایک ایسا ذخیرہ معلومات کا مہیا ہو جائے جو ان کو اس سبجکٹ میں مدد دے، لیکن ضمناً ان مضامین سے وہ بکار آمد ہدایتیں اور نصیحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن کی اس زمانے میں نہایت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں ۳۵ مضمون ہیں جن کے عنوان حسبِ تفصیل ذیل ہیں:

وقت، کفایت شعاری اور فضول خرچی، ورزش، تعلیمِ نسواں، بچپن کی شادی، بچوں کو زیور پہنانا، شرافتِ انسانی، اخلاق (یعنی حسنِ معاشرت) خوشامد، اتفاق، ہمدردی، صحبت یا ہمنشینی، ادب، محنت، ہمت اور استقلال، سفر، علم، مطالعہ، اخبار، چھاپہ، لکھنا، پڑھنا، حساب، صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، دیسی اور ولایتی کپڑا، ٹیکا اور چیچک، روشنی، ریل گاڑی، تاریخ و جغرافیہ۔

ایک آدھ علمی مضمونوں کے سوا یہ تمام مضامین اُن نصائح و اخلاق پر مشتمل ہیں جن کی فی زمانِنا ہندوستانیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً، نہایت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہر ایک مضمون کے متعلق وہ باتیں لکھی ہیں جو اسکول کلاسوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق اور اُن کی حالت کے مناسب ہیں۔ اور مطالب کے ادا کرنے میں ایسا سٹائل اختیار کیا ہے جس کی پیروی اور تتبع کرنے سے سکول کلاسوں کے طالب علم

مایوس نہ ہوں ۔ مضمون نگاری میں جب کہ اس سے کسی خاص درجے کے طلبہ کو انشا پردازی سکھانی مقصود ہو ، سب سے اہم اور ضروری بات یہی ہے کہ طرز بیان ایسی اختیار کی جائے جس کو اس درجے کے طالب علم بآسانی اختیار کر سکیں ۔

۱۱

ہاجرہ

(سرورق ترجمہ توزک عبدالرحمانی ، جلد اول)

ایک ترکی خاتون نے ترک عورتوں کی اصلاح و تربیت کے لیے اور اُن میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی غرض سے ترکی زبان میں ایک بہت دلچسپ ناول لکھا تھا ۔ جب یہ ناول شائع ہو کر ہندوستان میں پہنچا تو چوں کہ عام ناولوں کے برخلاف یہ ناول نہایت شائستہ اور مہذب طریقے سے لکھا گیا تھا اور اصلاحی و علمی رنگ اس میں غالب تھا ، اس لیے مولوی محمد حسن خاں صاحب اسسٹنٹ ملٹری ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا شملہ نے ، جو ترکی زبان اور اُس کے ادب سے بخوبی واقف تھے ، اس کا نہایت دلچسپ اور پُرلطف ترجمہ بزبان اردو ۱۸۹۷ع میں کیا ۔ جب ترجمہ ہو چکا تو اُسے تنقید اور تقریظ کے لیے ۱۸۹۸ع میں ملک کے مشاہیر کی خدمت میں بھیجا ، جن میں سے ایک مولانا الطاف حسین حالی بھی تھے ۔ مولانا کو ناولوں سے رغبت نہ تھی مگر مترجم کے اصرار اور خواہش سے آپ نے بہ نظرِ دل جوئی و حوصلہ افزائی سارے ناول کو پڑھا اور ختم کرنے کے بعد جو رائے آپ نے اس ناول کے متعلق مترجم کو لکھ کر بھیجی ، وہ اُنھوں نے کتاب

شائع کرتے وقت بڑے فخر کے ساتھ شروع میں شائع کی ، اور اپنی دوسری کتاب ترجمہ' توزک عبدالرحمانی جلد اول کے اندرونی سرورق پر بھی بطور اشتہار چھاپی ۔ وہیں سے لے کر یہ تنقید یہاں درج کی جاتی ہے ۔ یہ تنقید اُس رسم الخط سے مختلف تھا جو اُس وقت رائج تھا جس میں مولانا حالی نے اسے لکھا تھا ۔ وہ موجودہ رسم الخط سے قدرے مختلف تھا ۔ مثلاً ''ناول'' کو مولانا نے ہر جگہ ''نوول'' لکھا ہے ۔ ''اُسی'' کو ''اوسی'' اور ''اُس کے'' کو ''اوسکے'' وغیرہ ۔ (محمد اسماعیل)

''میں سید صاحب مرحوم کی لائف[1] لکھ رہا ہوں اور اب وہ قریب الاختتام ہے ، اس لیے مجھے بالکل ''ہاجرہ'' کے دیکھنے کی فرصت نہ تھی ۔ اس کے سوا ناول دیکھنے کا مجھے شوق بھی بہت کم ہے ۔ باوجود اس کے جس روز یہ کتاب میرے پاس پہنچی ، اُسی روز ایک ہی نشست میں میں نے سب کام چھوڑ کر اُس کے ۸۰ صفحے دیکھے ، پھر اور کاموں میں مصروف ہو گیا ۔ کل اُس کے دیکھنے کا پھر موقع ملا ۔ یہاں تک کہ جب تک اُسے ختم نہیں کر لیا دوسرا کام نہیں کیا ۔ وہ فی الواقعہ ایسا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد اُس کے چھوڑنے کو ہرگز نہیں جی چاہتا اور چوں کہ آپ نے ترجمہ بھی بہت صاف اور عمدہ کیا ہے ، اس لیے اُس کے پڑھنے سے طبیعت نہیں اُلجھتی ۔ یہ کتاب اس لحاظ سے کہ ناول نویسوں کے لیے ایک عمدہ رہبر ہے اور ہمارے ہم وطنوں کے چھچھورے ناولوں کی افراط و تفریط سے پاک ہے اور متانت و سنجیدگیِ بیان کا ایک اچھا نمونہ ہے ، نہایت مفید ہے ۔ لیکن جو خیالات اُس میں ظاہر کیے گئے ہیں اور جس طریقہ' معاشرت کی خوبی

اُس میں جھلکائی گئی ہے ، اس کے لیے ہماری قوم ابھی تیار نہیں ہے ۔ اور اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو کم از کم پچاس برس تک اُس کے لیے اور منتظر رہنا چاہیے ۔ بے شک تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان اُس کو بہت پسند کریں گے ۔ میری آرزو یہی ہے کہ لوگ آپ کی محنت کی داد دیں اور اس کی قدر کریں ۔

الطاف حسین حالی

---

[1] ''حیات جاوید'' سے مراد ہے جو سرسید کی نہایت مشرح و مفصل سوانح عمری ہے اور ۱۹۰۱ع میں شائع ہوئی ۔ (محمد اسماعیل)

۱۲

علماے سلف

ناظم صاحب ندوۃ العلماء لکھنؤ کی فرمائش پر نواب صدر یار جنگ مولوی محمد حبیب الرحمان خاں شروانی رئیس بھیکم پور نے "علماے سلف" کے نام سے ایک نہایت ہی بے نظیر کتاب لکھی، جسے اُنھوں نے ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ع میں بمقام میرٹھ خود پڑھ کر سنایا۔ کتاب کے ۱۳۲ صفحات ہیں اور وہ صرف چار ابواب پر منقسم ہے۔

ذیل میں وہ ریویو درج کیا جاتا ہے جو اس قابل قدر کتاب پر ۱۸۹۸ع میں لکھ کر مولانا نے نواب صاحب کو بھیجا تھا۔ یہ ریویو دو خطوط کی شکل میں ہے۔

(محمد اسماعیل)

(۱)

مہمانِ ناخواندہ عزیز تر از مہمانِ خواندہ پہنچا۔ باوجودیکہ آج کل ضیقِ فرصت کے سبب مطبوعاتِ جدیدہ کے مطالعے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے، اسی حالت میں قریب نصف کے رسالہ علماے سلف کو دیکھ گیا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارک کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے۔ شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ کیا مسلمانوں نے فنِ رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں؟ مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے در حقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئیل نے "سلف ہلپ" کے لکھنے میں کیا ہے۔ اس نے بھی ہزاروں بائیو گرفیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علماء کے حالات لکھنا اور بات ہے اور تمام بائیو گرفیوں کو دیکھ کر چند عنوان تجویز کرنے اور ہر عنوان کے مناسب اس دفترِ طویل الذیل سے مضامین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عنوانوں کے تحت درج کرنا نہایت محنت اور لیاقت اور غور و فکر کا کام ہے۔ آپ کی تصنیف میں اور مسٹر سموئیل کی کتاب میں صرف یہ فرق ہے کہ اس نے "سلف ہلپ" میں کتاب کا موضوع صرف علما میں محدود نہیں رکھا، بلکہ اس میں تمام رفارمر اور موجد و مخترع اور سٹیٹسمین اور سپہ سالار وغیرہ وغیرہ شامل ہیں اور اس رسالے میں صرف علماے سلف کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اگر آپ اس کے دائرے کو زیادہ وسیع کر دیتے تو یہ بالکل اسی قسم کی کتاب ہو جاتی جیسی "سلف ہلپ" ہے۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں مگر میں نے صرف ایک خوبی کا، جو کہ تمام تصنیف کی جان ہے، ذکر کرنا کافی سمجھا ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا۔ پس

تا وقتیکہ ندوۃ العلماء انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی، اس کی چیخ پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ صرف انگریزی تعلیم، جب تک اس میں مشرق تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی، ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ دے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے۔

میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دو دو جلدیں ہر مدرسۂ اسلامیہ میں رہنی چاہئیں۔ بلکہ محمڈن کالج کے طلبہ بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہے یا ندوۃ العلماء نے اس کو چھپوایا ہے۔ مسلمان اور خاص کر پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت ممسک ہیں۔ اس لیے مدارسِ اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے تمام رئیسوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح زیورِ علم و لیاقت و حسنِ اخلاق سے آراستہ کرے جیسا کہ اس نے شروانی رئیسوں میں آپ کو زیورِ علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور آپ کو جملہ مکروہاتِ روزگار سے محفوظ رکھ کر صد و سی سال تک زندہ و سلامت رکھے۔

خاکسار۔ الطاف حسین حالی عفی عنہ
از پانی پت۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۸ع

(۲)

آج باقی کتاب دیکھنے کا موقع بھی مل گیا اور کتاب کی عظمت پہلے سے بھی بہت زیادہ دل میں پیدا ہوئی۔ مختصر یہ ہے کہ

گزشتہ پانچ برس میں اگر کوئی کام ندوۃ العلماء نے کیا ہے تو علمائے سلف (کے حالات) کا لکھوانا ہے اور بس۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان طالب علم اس کو حرزِ جان بنائے۔ فجزاکم اللہ عنا و عن سائر مسلم الہند خیرا۔

خاکسار حالی از پانی پت
۱۲- ستمبر ۱۸۹۸ع

۱۳

انشاے نور احمد

(۲۸ نومبر ۱۸۹۹ع)

مولوی نور احمد پنجاب کے ایک لائق شخص ، اچھے ادیب اور قابل انشا پرداز تھے ۔ مرحوم ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور کے ممبر بھی رہ چکے تھے ۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ''انوار الاخلاق'' خاص طور پر مشہور ہے ۔ یہ بزرگ اُنیسویں صدی کے آخر میں اپنی مفید تصانیف سے سکولوں کے طلبا کی خاصی امداد کر رہے تھے ۔ چناں چہ ''انوار الاخلاق'' کے بعد اُنھوں نے طلبا کو خط و کتابت کا طریقہ سکھانے کے لیے ''انشاے نور احمد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو پنجاب کے تمام سکولوں کے لیے منظور ہو گئی ۔ ''انشاے نور احمد'' پر مندرجہ ذیل ریویو مولانا حالی نے مولوی نور احمد صاحب کی فرمائش پر ۲۸ نومبر ۱۸۹۹ع کو بطور خط لکھ کر اُنھیں بھیجا تھا ۔

(محمد اسماعیل)

اس انشاء کو میں نے لیٹے لیٹے دیکھا ۔ افسوس کہ میں اس وقت اس پر مفصل ریویو کرنے کے قابل نہیں ہوں ۔ مگر اس قدر بلا تصنع لکھتا ہوں کہ اُردو میں آج تک میں نے کوئی انشاء اس سے بہتر نہیں دیکھی ۔ آپ کی کتاب ''انوار الاخلاق'' بلا شبہ عمدہ کتاب ہے ، لیکن اس انشاء سے ہر شخص ، جو خط و کتابت سیکھنی چاہتا ہے ، پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے ۔ علاوہ خط و کتابت کے عرضی نویسی ، وثیقہ نگاری اور ہر قسم کی تحریریں ، جو کچہریوں اور دفتروں میں لکھی جاتی ہیں ، سب کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ رہبر ہے ۔ امید ہے کہ اس کی قبولیت روز بروز بڑھتی جائے گی اور مبتدیوں کو اس سے بے انتہا فائدہ پہنچے گا ۔

۱۴

تصانیفِ عزیز صفی پوری

(۱۹ دسمبر ۱۸۹۹ع)

منشی ولایت علی خاں صاحب متخلص بہ عزیز صفی پوری نے جولائی ۱۸۹۹ع میں مولانا کو اپنی چند کتابیں بغرض تبصرہ بھیجیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں نے یہ کتابیں حضور نظام کی خدمت میں بھی حیدر آباد دکن بھیجی ہیں ۔ مولانا کا مندرجہ ذیل تبصرہ ان ہی کتابوں کے متعلق ہے جو اُن کے مجموعۂ خطوط سے لیا گیا ہے ۔ (نقل از مکاتیب حالی صفحہ ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴) ۔

(محمد اسماعیل)

(۱)

مکرمت نامہ ، مع ''ارمغان''و ''نوربان'' اور رسالہ ''اشعارالاشعار'' کے شرفِ ورود لایا ۔ نہایت افسوس ہے کہ بہ سبب مکروہاتِ چند در چند کے ان تینوں عطیوں کی رسید اور شکریہ بھیجنے میں بہت دیر ہو گئی ۔ آمید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے ۔ اگر چہ ''ارمغان'' و ''نوربان'' کو دیکھ کر اس لحاظ سے نہایت خوشی ہوئی کہ اس زمانۂ نا پرساں میں ، جب کہ قدیم کمالات بہ سبب کساد بازاری کے صفحۂ روزگار سے مٹتے جاتے ہیں ، آپ جیسے صاحبِ کمال خاک دانِ ہند میں اب تک موجود ہیں اور جس متاع کا ملک میں

کوئی خریدار نہیں رہا اس کے آپ ہی مالک اور آپ ہی خریدار ہیں ۔ فارسی زبان کی کس مپرس حالت جو آج کل ہے اور آیندہ اس سے بھی زیادہ بے قدر ہوتی نظر آتی ہے ، اس کا سخت افسوس ہے :

مجلس چو بر شکست تماشا بما رسید
در بزم چوں نماند کسے جا بما رسید

'ارمغان' اور 'نوربان' کو میں نے بڑے شوق سے پڑھا اور چوں کہ غالب مرحوم کے بعد یہ اندازِ بیان اب تک کسی کی نظم و نثر میں نہیں دیکھا تھا ، ان نثروں کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلا : ''ھذا الذی رزقنا من قبل'' ۔ مگر یہ تو ارشاد ہو کہ اس جگر کاوی اور دماغ سوزی کا کچھ نتیجہ بھی ظاہر ہوا ؟ مجھے جس قدر ذوق اور لطف ان دونوں رسالوں کے پڑھنے سے حاصل ہوا ہے ، اس سے دس گنی زیادہ خوشی اُس وقت حاصل ہوگی ، جب یہ سنوں گا کہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ اور مدار المہام سر وقار الامرا بہادر نے ان نثروں کی قدر ان کے درجے اور مرتبے کے موافق فرمائی ۔ پس میں نہایت ممنون ہوں گا اگر جناب ان رسالوں کی سرگزشت سے ، جو حیدر آباد میں پہنچ کر ان پر گزری ، مطلع فرماویں گے ۔ زیادہ نیاز

خاکسار ، نیاز مند ، الطاف حسین حالی
۲۲ جولائی ۱۸۹۹ع

(۲)

''پیشکشِ شاہجہانی'' کی تین جلدیں عطیۂ جناب ، خاکسار کے پاس پہنچیں ، جن کو پڑھ کر آپ کے کمالِ انشا پردازی کا دل سے اقرار کیا ۔ افسوس ہے کہ اس طبقے کے بعد جس کے آپ اور میں ہوں ، کوئی ان کتابوں کا مطلب سمجھنے والا بھی نہ رہے گا ۔ چہ جائیکہ

ان کی خوبی کا سمجھنے والا اور مصنف کی لیاقت اور کوشش کی داد دینے والا کوئی نظر آئے :

مجلس چو بر شکست تماشا بما رسید
در بزم چوں نماند کسے جا بما رسید

معلوم نہیں کہ ''ارمغان'' و ''نوربہان'' کے ساتھ کوئی سلوک حیدر آباد کی طرف سے ظہور میں آیا یا نہیں ۔ خدا کرے کہ حضور شاہ جہاں بیگم صاحبہ '' پیشکشِ شاہجہانی '' کی حسبِ دل خواہ قدر کریں اور آپ کی کوشش اور لیاقت کی کما ینبغی داد دیں ۔ میں آپ کی یاد آوری اور عنایت اور غائبانہ محبت کا صمیمِ قلب اور خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ خدا تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کو فارغ البالی عنایت فرمائے ۔ آپ ان لوگوں کی یادگار ہیں جن کی نشانیاں صفحۂ روزگار سے روز بروز مٹتی جاتی ہیں ۔ پس آپ کا وجود اس زمانے میں غنیمتِ کبریٰ ہے ۔ زیادہ نیاز

خاکسار ، نیاز مند ، الطاف حسین حالی

۲۹- دسمبر ۱۸۹۹ع

۱۵

نظم دل افروز

(رسالہ معارف ، بابت ماہ اپریل ۱۹۰۰ع)

میرزا غالب کے شاگرد ، مولانا حالی کے دوست ، ظہیر دہلوی کے بھائی صلاح الدولہ مرصع رقم سید جلال الدین حیدر کے فرزند سید شجاع الدین حسین دہلی کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں ۔ انور تخلص کرتے تھے ۔ عین عالمِ شباب میں بہ عمر ۳۸ سال ۱۸۸۵ع میں سفرِ آخرت اختیار کیا ۔ اُن کے انتقال کے چودہ پندرہ برس بعد ۱۸۹۹ع میں ملک کے مشہور ادیب اور 'خمخانۂ جاوید' کے مؤلف لالہ سری رام ایم ۔ اے نے ان کا دیوان ، جو قدیم شاعری کا اعلیٰ درجے کا نمونہ تھا ، رفاہ عام پریس لاہور میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا ۔ جس طرح انور عرف عام میں امراؤ مرزا کے نام سے مشہور تھے ، اسی طرح ''نظم دل فروز'' دیوان انور کے نام سے مشہور ہے ۔ مولانا حالی کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا ، اب عام طور سے نہیں ملتا ۔ مولانا حالی نے اس پر ریویو اپنے دوست مولوی سید وحید الدین سلیم کے رسالے معارف میں کیا تھا جہاں سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔ یہ رسالہ علی گڑھ سے جاری ہوا تھا ، بعد میں پانی پت سے شائع ہونے لگا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

غالب ہے ، نہ شیفتہ ، نہ نیّر باقی
وحشت ہے ، نہ سالک ہے ، نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

وہ زمانہ جب کہ دلی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کے لیے سنبھالا لیا تھا ، اگرچہ اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آیندہ کے لیے بالکل بند ہو گئی تھیں مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہلِ کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا ۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے ، لیکن مرغانِ خوش الحان خزاں کی آمد سے بے خبر بہ دستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے ۔ دلی کا یہ اخیر جھمکڑا ، جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے ، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلے کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دنیا سے رخصت کیا ہے :

اب محو بوے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

اسی قافلے میں ایک جوان صاحبِ کمال سید شجاع الدین حسین انور ، عرف امراؤ مرزا ، خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خاں سید جلال الدین حیدر رضوی استاد بہادر شاہ بادشاہ تھے ، جو ۱۸۵۷ع میں ، جب کہ سپاہ باغی کے ہنگامے نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی ، بہ عمر سیزدہ سالگی اپنے والد بزرگوار اور برادر بزرگ سید ظہیر الدین حسین ظہیر کے ہمراہ پانی پت میں آ کر کئی برس تک یہاں مقیم رہے ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس یوسفِ خانماں آوارہ اور خاک میں ملے ہوئے موتی نے راقم کو اپنا خریدار بنایا ۔ بیگانگی ایک ہی نگاہ میں آشنائی کے ساتھ بدل گئی اور آشنائی نے جلد جلد محبت و یک جہتی کی سرحد میں قدم رکھنا شروع کیا ۔ مگر

زمانہ آناً فاناً رنگ بدل رہا تھا اور انقلاب پر انقلاب ہو رہا تھا ۔ وہ صحبت بہت جلد برہم ہو گئی اور بھولے ہوئے خواب کی طرح اُس صحبت کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا ۔ لیکن کچھ بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ شاہ جہاں آباد ہمیشہ کے لیے فقیر کا رمنا بن گیا ۔ اتفاق یہ ہے کہ محبت نے جس قید خانے میں لے جا کر مقید کیا ، سید انور بھی اُسی قید خانے کے اسیر نکلے ۔ مخدومی محمد کرم اللہ خاں شیدا کا دیوان خانہ ، جو دوستی اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کا ملجا و ماویٰ اور زندہ دلی کا جنم بھوم ہے ، سال ہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں اور ان صحبتوں میں سید انور ، سید ظہیر اور مرزا سالک اکثر شریک ہوتے تھے ، اور تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے دست بردار ہو کر ہر شخص زبانِ حال سے اس شعر کا مضمون ادا کرتا تھا :

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

لیکن آخرکار نہ معلوم شعر کی نحوست سے یا اس سبب سے کہ زمانہ تفرقے کی بنیاد ہمیشہ کے لیے سوسائٹی میں ڈال چکا تھا ، اکثر اصحاب دلی چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر و پراگندہ ہو گئے ۔ اگرچہ ایک مدت کے بعد راقم لاہور سے اور سید انور جے پور سے دلی میں پھر آ گئے مگر چوں کہ دفترِ قضا سے فراقِ دائمی کا فرمان جاری ہو چکا تھا ، ابھی گذشتہ مفارقت کا زخم بھرنے نہ پایا تھا کہ اُس مرحوم نے عالمِ آخرت کی راہ لی اور جو زخم بھرتا آتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ناسور بن گیا ۔ سید انور مرحوم میں کمال شاعری کے علاوہ متعدد کمالات جمع تھے ۔ خط نسخ میں وہ بلا مبالغہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ۔ اس فن میں جو کمال اُن کے جدّ بزرگوار نے قاضی عصمت اللہ دہلوی سے حاصل کیا تھا ، سید انور پر گویا اُس کا

خاتمہ ہو گیا تھا ۔ باوجود اس کے نستعلیق میں بھی وہ شہر کے عام خوش نویسوں میں کسی سے کم نہ تھے اور یہ جامعیت اُن کی خاندانی خصوصیات میں سے تھی ۔ وہ صرف شاعر اور خوش نویس ہی نہ تھے بلکہ علوم متعارفہ میں بھی کافی دست گاہ رکھتے تھے ۔ اُنھوں نے اس کلیے کو کہ ''الکاتب جاھل'' غلط ثابت کر دیا تھا ۔ خصائل و عادات کے لحاظ سے میں ان کو مستثنیٰ لوگوں میں شمار کرتا تھا ۔ سادگی و پرہیزگاری ، آزادہ روی و خودداری ، ہر حال میں خوش رہنا اور اُس اشراف گردی کے زمانے میں پاسِ وضع کو ہاتھ سے نہ دینا ، اُن کی خاص خصلتیں تھیں ۔ انھوں نے اُس وقت جب کہ خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا ، اپنے دست و بازو پر بھروسا کیا اور جس جان نے بے فکری اور فارغ البالی کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا ، اُس کو فوراً محنت و مشقت میں ڈال دیا ۔ اور جوان مردوں کی طرح اہل و عیال کے لیے دوڑ دھوپ اور تگ و دو میں بسر کی ۔ بزرگوں کے کمالات ، جو اگلے زمانے میں نام و نمود اور عزت اور شرف کے ذریعے خیال کیے جاتے تھے ، جب وقت پڑا تو اُن کو بے تکلف ذریعۂ معاش گردانا ۔ اور جواہر گراں بہا کو ، جب کہ بازار میں کوئی جوہری نظر نہ آیا ، کنبے کے نان و نفقہ پر قربان کر دیا ۔ اللہ اللہ اُس مرحوم جامع اوصاف کمال کی تصویر آج پندرہ برس بعد پھر آنکھوں کے سامنے آئی ہے ۔ ہمارے عزیز دوست لالہ سری رام ایم ۔ اے خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال ایم ۔ اے بیرسٹر ایٹ لا رئیس دہلی نے سید انور مرحوم کا دیوان چھپوا کر از راہ محبت ہمارے پاس بھیجا ہے ، گویا مدت کے بچھڑے ہوئے دوست کو دوست سے ملایا ہے ۔ ہم حیران ہیں کہ اپنے عزیز دوست لالہ سری رام کی اس مہربانی اور یاد آوری کا شکریہ ادا کریں یا اُن کی اُس کوشش اور توجہ کی داد دیں جو

انھوں نے اپنے وطن کے ایک صاحب کمال کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے نام زندہ کرنے میں فرمائی ، یا اُس احسان کا ذکر کریں جو عزیز موصوف نے اس دیوان کی اشاعت سے سید انور کے دوستوں اور عزیزوں پر کیا ، یا اُس کیفیت کو بیان کریں جو اس دیوان کو دیکھ کر ہمارے دل پر گزری ہے ۔ اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانے کی زبردستی سے اُس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے تھے ۔ اس میں بہت سی غزلیں اُن مشاعروں کی ہیں جن پر دلی کی شاعری کا خاتمہ ہونے والا تھا ، اور جن میں بارہا سید انور ، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ شریک ہو کر ہم نے اُن کی ہم طرحی کی عزت حاصل کی تھی ۔ کبھی کبھی نواب مرزا خاں داغ بھی رام پور سے آ کر ان مشاعروں میں مشتاقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے ۔ اور شہر کے اکثر شریف زادے اور امیر زادے ، جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں ، ہر طرح کی زمینوں میں زور طبع دکھاتے تھے ۔ مرزا غالب مرحوم و مغفور کا اخیر زمانہ تھا ۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر اُن کی دیکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں برابر آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں ۔ گو اب خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے اور پچھلی حالت کے تصور سے شرم آنے لگی ہے مگر گزرا ہوا زمانہ ، خواہ بچپن کی نادانی کا زمانہ ہو یا جوانی کی بدمستی کا ، اُس کی یاد میں عجیب لذت رکھی گئی ہے ۔ کہ کوئی چیز اُس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی ۔ پچھلا زمانہ ، جیسا کہ کہا گیا ہے ، بعینہ نمائشِ سراب کا حکم رکھتا ہے کہ جب پاس تھے تو ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا مگر دور سے وہی ٹیلے دریائے مَوّاج کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں ۔ وہی مشاعرے جو اب بچوں کا

کھیل معلوم ہوتے ہیں ، اگر اُن کا پھر ہاتھ آنا ممکن ہو تو کون ایسا بے دید اور طوطا چشم ہوگا جو نئی روشنی کو اُس قدیم تاریکی سے بدلنے پر فی الفور آمادہ نہ ہو جائے ۔ سچ ہے :

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد
لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ دیوان جس کا نام معزز اشاعت کنندہ نے ''نظم دل افروز'' رکھا ہے اور ہم اُس کو اس لحاظ سے کہ وہ صاحبِ دیوان کی جدائی کا داغ تازہ کرنے والا ہے ، ''نظم دل گداز'' کہتے ہیں ، شاید نئے بگڑے ہوئے شاعر اُس کی جیسی کہ چاہیے قدر نہ کریں اور ایک نئے مسلمان کی طرح ، جس کا قصائی کی دوکان کے سوا کہیں جی نہیں لگتا ، اس دیوان کے ساتھ شاید کچھ دلچسپی ظاہر نہ کریں ، مگر جو لوگ پرانے مذاق کے متوالے ہیں اور اب تک اُنھیں پر ملک کی شاعری کا دار و مدار ہے ، ان کے لیے یہ دیوان ایک نعمتِ غیرمترقبہ ہے ، جو ہمارے معزز دوست کی بدولت ملک میں عام طور پر شائع ہوا ہے اور مطبع رفاہ عام لاہور سے بہت ارزاں قیمت پر بحساب ۱۲ (آنے) فی جلد مل سکتا ہے ۔

١٦

جدید اُردو لٹریچر کے مشہور مصنفین

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۳۱ - ۳۲)

یہ کتاب انگریزی میں سر شیخ عبد القادر ایڈیٹر 'مخزن' نے لکھی تھی ۔ حضرت مولانا حالی نے اس پر اپنے جو خیالات ۹- جون ۱۹۰۰ع کو لکھ کر بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کو حیدر آباد بھیجے تھے ۔ وہ یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب اُس وقت حیدر آباد سے ایک ماہوار ادبی رسالہ ''افسر'' کے نام سے نکالا کرتے تھے ۔
(محمد اسماعیل)

''افسر'' کا چھٹا نمبر پہنچا ۔ 'جدید اُردو لٹریچر کے مشہور مصنفین' پر جو ریویو آپ نے تحریر فرمایا ہے ، اس کو میں نے بہت غور سے پڑھا ۔ شیخ عبدالقادر صاحب بی ۔ اے ایڈیٹر پنجاب آبزرور نے یہ اسے میرے پاس بھی بھیجا تھا ۔ مگر چوں کہ وہ انگریزی میں تھا اس لیے میں اس کے مضمون سے مطلع نہیں ہو سکا ۔ ہاں سرسری طور پر اس زمانے میں ، جب کہ یہ مضمون پنجاب آبزرور میں چھپ رہا تھا ، میں نے یہ سنا تھا کہ اُنھوں نے فلاں فلاں اشخاص کے لٹریری ورکس پر کچھ لکھا ہے ، اور جو کچھ میری نسبت لکھا ہے ، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کا بھی کسی دوست نے مجھ سے ذکر کیا تھا ۔ شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں اور میرے دوست ہیں ۔ ان کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے

بلکہ اردو لٹریچر سے بھی ایک خاص مناسبت ہے اور اس کا ثبوت یہی اسّے ہے جو انھوں نے جدید آردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے۔ اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع کے لوگوں پر ، جو کہ اپنے تئیں آردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں ، اپنی فوقیت ثابت کر دی ہے ، کیونکہ آج تک دلی سے لکھنؤ تک کے کسی شخص نے اس مضمون پر قلم نہیں اُٹھایا ۔ رہی یہ بات کہ بعض جزئیات میں آپ نے ان سے اختلاف کیا ہے ، سو یہ اپنا اپنا مذاق اور اپنا اپنا ٹیسٹ ہے ۔ مجھے بھی ان کی رائے سے کسی قدر اختلاف ہے ۔ نہ اس نظر سے کہ ان کی رائے میری نثر کی نسبت اچھی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ آردو لٹریچر کے ہیروز کا انتخاب ، جو اُنھوں نے کیا ہے ، وہ نہ جامع ہے اور نہ مانع ۔

میں آپ کے ریمارکس کا ، جو آپ نے میری نثر کی نسبت کیے ہیں ، دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ، مگر سچ یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک ، جب تک کہ ہم اور ہمارے طرف دار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں ، قائم نہیں ہو سکتیں ، بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کون سی خوبی ایسی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے ۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبری نیست
در دل ہوسی ہست و ندانم کہ کدام ست

۱۷

مضمون "مسئلۂ ازدواج"

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۵۴)

بابائے آردو مولوی عبدالحق صاحب ایک بہت ہی اعلیٰ پایے کا ادبی پرچہ "افسر" حیدر آباد دکن سے نکالا کرتے تھے ۔ اُس کے جون ۱۹۰۱ع کے شمارے میں کسی صاحب مولوی محمد اختر نے ایک مضمون مندرجہ بالا عنوان سے لکھا تھا ۔ جب یہ پرچہ مولانا حالی کے پاس پہنچا تو آپ نے اس مضمون کو پڑھ کر اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب ایڈیٹر کو جو خط لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ یہ خط مولانا نے ۲۸ نومبر ۱۹۰۱ع کو حیدر آباد دکن بھیجا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

مئی اور جون کا "افسر" پہنچا ۔ "حیاتِ جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا ۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں ، اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا ، لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں ۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران 'بار فروشی' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں ، چھڑک کر بیچنا ، کہتے ہیں ۔ خدا تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور اپنے تمام مقاصد میں کامیاب کرے ۔

مئی کے پرچے میں مسئلۂ ازدواج پر جو مولوی محمد اختر صاحب کا مضمون چھپا ہے ، اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ نہ صرف میں نے بلکہ جس شخص نے اس کو دیکھا ، حد سے زیادہ پسند کیا ۔ آپ کے ریویو کی تعریف کرنی مجھ کو زیبا نہیں ہے ورنہ وہی مثل ہوگی : ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو ۔“

۱۸

کلیات دلمیر

(رسالہ ’معارف‘ پانی پت ، جلد ۴ ، نمبر ۱۲ ،
بابت دسمبر ۱۹۰۱ع)

> یہ ایک بہت ہی پُر لطف ، دلچسپ اور مزاحیہ نظموں کا بڑا ہی مزے دار مجموعہ تھا ، جو دہلی کے قرب و جوار کی دیہاتی زبان میں بہت قادر الکلامی کے ساتھ لکھا گیا تھا ۔ یہ کتاب دیہاتی زبان کا شاید سب سے پہلا نمونہ تھا ، مگر بڑی ہی عمدگی سے مرتب کیا گیا تھا ۔ میں نے یہ کتاب مولانا حالی کی لائبریری میں دیکھی تھی مگر وہ لائبریری غارت ہو گئی اور اُس کے ساتھ ہی یہ کتاب بھی ؛ البتہ جو ریویو اس پر مولانا نے کیا تھا ، وہ باقی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

”کلیات دلمیر“ ایک نئی قسم کا دیوان ہے جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے ۔ صاحبِ دیوان ایک بزرگ منور خاں نام، دلمیر تخلص ، رئیس میرٹھ ہیں ۔ ۱۸۵۰ع میں اُنھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں ، جو درمیان دو آب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی جاتی ہے ، لکھ کر مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ کی حضور میں پیش کی تھیں ۔ وہاں اُن نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا ۔ اس قدردانی نے میاں دلمیر کے خیالات پر وہی اثر کیا ، جو سلطان سنجر

کے ملک الشعرا کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحد الدین انوری کے دل پر ہوا تھا ۔ انھوں نے اسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے ۔

میرے ایک لائق دوست نے ، جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتے ہیں ، مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ اس دیوان میں جو شاعرانہ خوبیاں اور محاسن ہیں ، ان کو کسی قدر پبلک پر ظاہر کروں اور لوگوں سے میاں دلمیر اور ان کے کلام کو روشناس کراؤں ۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے ، وہ در حقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اردو ہے ، جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے ۔ پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ ، جو فصیح اردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں ، کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوئے ہیں ، جیسے خالق اور کھالک ، باپ اور باہو ، مھارے اور ہمارے ، چپے چپے اور چپاں چپاں ، تو نے اور تیں نے ، کیا اور کینا دیا اور دینا وغیرہ وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو ، جس کی مادری زبان شہری فصیح اردو ہو ، بگڑی ہوئی اردو سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے ۔ مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے اور جس پر سوا اس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو ، کوئی قادر نہیں ہو سکتا ، وہ یہ ہے کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے اس کا پیرایۂ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو ۔ کیوں کہ فصاحت در حقیقت اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے کہ مثلاً اگر بچوں کے ساتھ بات چیت کرو تو بچے بن جاؤ اور گنواروں کے ساتھ گفتگو کرو تو اپنے تئیں ٹھیٹ گنوار بنا لو ۔

اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلمیر کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بہ آواز بلند گواہی دیتی ہے ۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے ، اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے ۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے :

ہے مرے کھالک ! ہے مرے مالک !
تو باہو ہم تیرے بالک

(ہے : حرف ندا یعنی اے ۔ کھالک : خالق ، باہو : باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایے میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں ۔

مھارے[1] حاکم ہو، مھارے سوائی[2]
چپاں چپاں[3] تیری دہائی
تیں[4] پانی سوں مانس[5] کینا[6]
سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا[7]
تیرے سانچے انیک[8] نرالے
جن سانچوں لکھ کایا[9] ڈھالے

خدا کی حکمتِ بالغہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور ان گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی :

---

(۱) ہمارے ۔ (۲) سردار ۔ (۳) چپے چپے ۔ (۴) تو نے ۔ (۵) آدمی ۔ (۶) بنایا ۔ (۷) دیا ۔ (۸) بے شمار ۔ (۹) لاکھوں ، جسم ۔

انبر[1] ، دھرتی ، سورج ، چندر
ولی[2] ، دیوتا ، پیر ، پگمبر[3]
سب تری ڈوڈھی[4] سیس[5] نواویں[6]
تجھے[7] نے پوجیں تجھے نے گاویں[8]
جے[9] تو اپنا چھوہ[10] دکھاوے
انبر[11] دھرتی[12] چھوہ[13] ہو جاوے[14]
توں[15] بیڑے کا کھیون ہارا[16]
تیرے ہاتھوں ہے نستارا[17]
آئے پڑی منجدھاروں[18] نیا[19]
تجھ بنا دیکھے ناہیں[20] کھویا[21]
توں نیا[22] نو پار لگاوے
مجھ ڈوبے نو[23] تو ہی تراوے
توں ہی مارے توں ہی نواجے[24]
تیرا دھونسا[25] انبر[26] باجے

چوں کہ بادشاہوں اور امیروں کے نقارخانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تا کہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سننے والوں کو ان کی زیادہ شان و شوکت معلوم ہو ، اس لیے عوام کے خیال کے موافق عظمت و جلالتِ الٰہی کو اس پیرایے میں بیان کرتا ہے کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے :

---

(۱) آسمان - (۲) اوتار - (۳) پیغمبر - (۴) ڈیوڑھی - (۵) سر - (۶) جھکائیں - (۷) تجھی کو - (۸) تیرا نام لیں - (۹) اگر - (۱۰) غصہ - (۱۱) آسمان - (۱۲) زمین - (۱۳) سب فنا - (۱۴) ہو جائے - (۱۵) تو - (۱۶) ملاح - (۱۷) نجات - (۱۸) یعنی منجدھار میں - (۱۹) کشتی - (۲۰) نہیں - (۲۱) کھینے والا - (۲۲) کشتی کو - (۲۳) کو - (۲۴) نوازے - (۲۵) نقارہ - (۲۶) آسمان پر بجتا ہے -

سورج کاڈھے[1] ، چندر چمکاوے   پربت ڈھاوے[2] سمندر[3] بہاوے
توں ہی لاڑے[4] میگھ ملارا[5]   توں ہی بواوے بوہنڈا[6] مہارا[7]
توں کھیتاں نو بیال چلاوے   توں پودا نو دھوپ لگاوے
کھیت اگاوے ناج پکاوے   سگری[8] پر جا ، جا[9] نو کھاوے

سورج اور چاند کا نکالنا ، پہاڑوں کا بلند کرنا ، سمندر کا بہانا ، مینہ برسانا ، زمین بوانا ، کھیتی پر ہوا چلانا ، اس پر دھوپ نکالنا ، بیج اگانا ، اناج پکانا اور اس سے ساری مخلوق کی پرورش کرنا ، یہ سب ایسے صاف اور کھلے ہوئے مظاہر قدرت ہیں جن سے بڑھ کر خدا کی عظمت و جبروت کا خیال خاص کر ایک زراعت پیشہ دیہاتی گنوار کے دل میں کسی ذریعے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا :

تجھ[10] بنا جن کوئی دوجا[11] پوجا
وا کی[12] انکھاں نیل کا سوجا
دین دُنی کی کھوئی کھوبی[13]
وا کی[14] نیا[15] ربت میں ڈوبی
ہے مرے صاحب بکسن[16] ہارے
پاڑ دے[17] کھوٹے کاگد[18] مہارے
توں ہی مہارا پالن ہارا
تیرا ان[19] کھاوے جگ سارا
دل میرا ہے تیرا داسی[20]
تو ہی دے گا تاتی[21] باسی

---

(۱) نکالے - (۲) اٹھاوے ، یعنی بلند کرے - (۳) سمندر - (۴) نکالے یا برسائے - (۵) باران رحمت - (۶) کوہیت - (۷) ہمارا - (۸) ساری مخلوق - (۹) جس کو - (۱۰) تیرے سوا جس نے - (۱۱) دوسرا - (۱۲) اس کی آنکھوں میں سؤا یعنی سلائی - (۱۳) خوبی - (۱۴) اس کی - (۱۵) کشتی - (۱۶) بخشنے والا - (۱۷) پھاڑ دے - (۱۸) کاغذ یعنی نامۂ اعمال - (۱۹) رزق - (۲۰) غلام - (۲۱) گرم یعنی تازی روٹی -

یہ چند بیتیں اس نظم میں سے لی گئی ہیں جو دلمیر نے اپنے دیوان کے شروع میں حمد الٰہی میں لکھی ہیں ۔ ان کے پڑھنے سے ہر شخص ، جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے ، بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ صاحب دیوان جس طرح گنواری زبان اور اُس کے محاورۂ روزمرہ پر پوری قدرت رکھتا ہے ، اسی طرح وہ ہر ایک مطلب کو گنواروں کے خیالات اور ان کے مبلغ فکر کے موافق اُسی گنواری زبان میں ادا کرنا جانتا ہے ۔

حمد کے بعد نعت میں اس مطلب کو کہ آں حضرتؐ قیامت کو ہماری شفاعت کریں گے ، اس طرح ادا کرتا ہے :

''جگ پرلوں مہاری مکتاں اوٹی''

پھر اس مطلب کو کہ آپ کے چاروں یاروں نے دنیا میں اسلام کو پھیلا دیا ، اس طرح بیان کرتا ہے :

نبی صاحب کے چار سپائی[۱]
جنہاں[۲] نے ملکوں دھومیں ٹھائی[۳]
کر دیے لکھوں نیم[۴] کے بندے
نرمل[۵] ہو گئے ماڑنس[۶] گندے

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرتؐ کی پیروی نہ کی ، وہ تباہ ہوا ، اس طرح ادا کرتا ہے :

جو کوئی وا کی[۷] گیل[۸] نہ چالا
وا کا دو جگ[۹] مہرا[۱۰] کالا
ڈوب گیو وہ کرموں ہینا[۱۱]
جن[۱۲] حجرت[۱۳] کا سنگ نہ لینا[۱۴]

---

(۱) سپاہی ۔ (۲) جنہوں نے ۔ (۳) دھوم مچائی ۔ (۴) ایمان ۔ (۵) پاک ۔ (۶) آدمی ۔ (۷) اس کی ۔ (۸) ہمراہ ۔ (۹) دونوں جہان میں ۔ (۱۰) منہ ۔ (۱۱) نصیبوں کا ہینا ۔ (۱۲) جس نے ۔ (۱۳) حضرت ۔ (۱۴) ساتھ نہ لیا ۔

ایک شخص اپنے وطن اور اہل و عیال سے دور جا پڑا ہے ، گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہو کر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے :

ہے مرے[۱] صاحب ! یو[۲] کے کینا[۳]
مجھ[۴] نے دیس نکاڑا[۵] دینا
میں نے کے[۶] تیری بھوریں کھیدیں[۷]
جے مرے[۸] کاڑجے برچھی چھیدیں

اپنے صاحب ، یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے ۔ چوں کہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں ، اس لیے انھی کے خیالات کے موافق خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری چھین لی ہے جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلہ لیا ہے :

چھٹ گئے سگرے[۹] ناتی گوتی[۱۰]
دادا نانا پوت[۱۱] پڑوتی[۱۲]
ناؤ[۱۳] ، بامن[۱۴] ، ہالی[۱۵] ، گمیرے[۱۶]
جنہاں نت میرے ڈانگر گھیرے[۱۷]
کہاں گئے اوہ[۱۸] ایکھہ کے گانڈے[۱۹]
کہاں گئے اوہ مینڈے[۲۰] ڈانڈے
کہاں گئی اوہ کھیتی مہاری
کہاں گئی اوہ گاجر کیاری

---

(۱) اے میرے خدا ۔ (۲) یہ کیا ۔ (۳) کیا ۔ (۴) مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی ۔ (۵) دے دی ۔ (۶) میں نے کیا ۔ (۷) تری بھوری بھینس نکال لی ہے ۔ (۸) کہ تو نے مرے کلیجے میں برچھی چبھو دی ہے ۔ (۹) سارے ۔ (۱۰) رشتہ دار ۔ (۱۱) بیٹا ۔ (۱۲) پوتے کی بیٹی ۔ (۱۳) نائی ۔ (۱۴) برہمن ۔ (۱۵) ہل چلانے والا ۔ (۱۶) خادم ۔ (۱۷) جو ہمیشہ میرے مویشی گھیر گھیر کے لاتے تھے ۔ (۱۸) وہ ۔ (۱۹) گنے ۔ (۲۰) کھیت کی ڈول اور پگڈنڈی ۔

اسی طرح کہیں جستی حقے اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے ، کہیں بھابھڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ ، کھٹولی ، گوبر کی ڈھیریوں ، سانی کی ناندوں ، دودھ دہی کی کوری مٹکیوں ، سرسوں کے ساگ اور مکا کی روٹی ۔ اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دیہاتی زندگی کے مناسب ہیں ، حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے ۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہرا دلمیر سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدون نہیں کیا اور نہ اتنے مختلف مضامین ، جتنے کہ اس دیوان میں ہیں ، کبھی اس زبان میں بیان کیے گئے ہیں ۔ اس میں حمد و نعت ، منقبت ، اخلاق ، مدح ، ہزل ، عشق ، ہجر ، وصل ، رشک غرضکہ وہ تمام بیانات ، جو اُردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں ، موجود ہیں ۔ پس اردوے معلیٰ کے شعرا ، جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آئے ہیں ، اُن میں اور دلمیر میں وہی فرق ہے جو مقلد اور موجد میں ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورۂ بالا میں کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں تو اس کے ادا کرنے کے لیے سینکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات و تراکیب اُردو لٹریچر میں مہیا پاتے ہیں ۔ ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے ، جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے ، بے تکلف لڑی میں پرو لیتے ہیں ۔ برخلاف اس شخص کے جس کو اول غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہنچانی ، پھر اُن میں سے موتی نکالنے ہیں ، پھر ان کو جلا کرنا ہے ، پھر بیندھنا ہے ، پھر لڑی میں پرونا ہے ۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے ۔ باوجود اس کے دلمیر نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کیے ہیں جن کا

ایک گنواری زبان میں سما جانا سخت مشکل ہے ۔ مثلاً انگریزی عمل داری کی تعریف میں ، نو ایجاد توپوں اور بندوقوں کا بیان ، ریل ، تاربرق ، سڑکوں اور نہروں کا بیان ، برف کی کل اور واٹر ورکس کا بیان ، دیا سلائی ، گیس اور برق روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ ۔ مذکورۂ بالا بیان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں :

جَگ جُگ[۱] رہے پھرنگی راج   یو راجے ، راجوں سرتاج[۲]
راجا راجی ، سکھی کسان   یو راجا[۳] ، پرجا کی جان
بڈے بادچھا[۴] ، بڈے نسابھ[۵]   بڈے اکل ور[۶] ، بڈے سرابھ[۷]
انگریجاں کا ملکوں راج   راجا بڈے گریب نواج
انگریجاں کی بانکی پھوج   جابد[۸] چڈھے سمندر موج
پڑے سمندروں گھنے جہاج   جا میں[۹] راکھیں بھر بھر ناج
کھاوے پھوج انگھاوے[۱۰] پھوج   بیٹھی باجے بجاوے پھوج
توپاں چلیں گھٹا گھنگور   کاسوں[۱۱] ہو سرکار کی ہور[۱۲]
تورا[۱۳] لگے نہ دارو[۱۴] موکھ[۱۵]   اپو آپو چلیں بندوکھ
بند[۱۶] بندوکھاں لمبی نال   داگی[۱۷] دگیں نہ دو دو سال
بند راج کھوٹی تروار   گاجر کٹے نہ سو سو مار
راج پھرنگی رہے انند   جد لگ انبر ، سورج ، چند
ریل لگاڑی[۱۸] کاڈھے تار   دن میں چالے میل ہجار
تار کھبر سوں راتوں رات   لاکھ کوس سوں کر لو بات
اچرج بڑی برپھ[۱۹] کی کل   واے[۲۰] گھوماوے کونسامل[۲۱]

---

(۱) ہمیشہ ہمیشہ ۔ (۲) یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں ۔ (۳) راجا ۔ (۴) بادشاہ ۔ (۵) انصاف ۔ (۶) عقل ور ۔ (۷) اشراف ۔ (۸) جن میں ۔ (۹) جن میں ۔ (۱۰) سیر ہو ۔ (۱۱) کس سے ۔ (۱۲) برابری ۔ (۱۳) توڑا ۔ (۱۴) بارود ۔ (۱۵) پیالہ میں ۔ (۱۶) ہندوستان کی بندوقیں ۔ (۱۷) داغنے سے نہیں دغتیں ۔ (۱۸) نکالی ۔ (۱۹) برف ۔ (۲۰) اس کو ۔ (۲۱) پہلوان ۔

کاگج دام جلاوے کون؟   ایسا ٹھاڈا آوے کون؟
سڑک[۱] بنائیں کھودیں نہر   کھیت کھیت پانی کی لہر
جا سے ہو لکھوں من ناج   کدھیں رہیں نا ٹھالی[۲] چھاج
بہبے دنے[۳] دھرتی ماں گال   تلے تلے پانی کی چال
بگڑ بگڑ مانھ[۴] لانے[۵] نل   جا میں آوے نرمل جل
یاہی بُد سوں جلیں چراگ   نا باتی، نا تیل، نہ آگ
نا کوئی دیوا بالن[۶] واڑا   آپو آپو ہو آجیاڑا[۷]
آپو تڑکے[۸] جاویں بجھ   اچرج[۹] مانیں مجھ اور تجھ
بڈے بڈے پر جانو سکھ   ناہیں رہے اب دھرتی دکھ

اب ہم چند اشعار دلمیر کی غزلوں میں سے بطور نمونے کے نقل کرتے ہیں:

آجا مھارے منتر[۱۰]! آجا   موا پڑا ہوں موہے[۱۱] جوا[۱۲] جا
پیت نہ کرے، میت کسی کی   پیت نہ چھوڑے کوٹھی ناجا[۱۳]
ہے من اوت[۱۴]! گیو کے تیرو؟   مھارے[۱۵] ہی اوپر دھونسا باجا

باولے من[۱۶]! یو کے کینا؟   من، دھن سگرا نیامی[۱۷] دینا
پیت[۱۸] لالے[۱۹] پرتیت[۲۰] گنوادی   پھٹ پھٹ بیری! تیرا جینا

---

(۱) سڑکیں بنائیں، نہریں کھودیں۔ (۲) بیکار۔ (۳) بہیے زمین میں لگائے۔ (۴) میں۔ (۵) لگائے۔ (۶) روشن کرنے والا۔ (۷) اُجالا۔ (۸) صبح کو۔ (۹) اچنبھا۔ (۱۰) دوست۔ (۱۱) مجھے۔ (۱۲) جلاجا۔ (۱۳) غلہ۔ (۱۴) اے احمق دل تیرا کیا گیا۔ (۱۵) یعنی مصیبت ہمیں پر آپڑی۔ (۱۶) اے باولے دل۔ (۱۷) مفت دے دیا۔ (۱۸) محبت۔ (۱۹) لگا کے۔ (۲۰) عزت۔

ایک[۱] دنا نو کہکے گیو ہے   بیت[۲] گیو اب ایک مہینا
مھارا گات[۳] سندھ[۴] نے تیرے   رین[۵] دنا[۶] پہلا سا[۷] پینا

ناہیں رہو من بیری بس کا   یانے[۸] پڑگیو چسکا جوبن رس کا
بیٹھ گیو دیہل[۹] یتم[۱۰] لڑکی   کسی کا نا کھسکایا[۱۱] کھسکا
میں کیلی تو نے بن بن ڈھونڈوں   تو تو جوڑا بچھڑ گیو سارس کا

دوڑیو رے دوڑیو میرے بگڑ دھاڑا پڑا
ناج کھایو، مال کھوسا[۱۲] ایک چھوری[۱۳] نے بڑا[۱۴]
توں مڑوڑے[۱۵] سیج[۱۶] مارے سانجھ[۱۷] سوں تڑکا لکاڑ[۱۸]
میں لکھاؤں[۱۹] باٹ تیری گانو کے گورے[۲۰] کھڑا
تیر پڑکاں[۲۱] سوں چلاوے سین[۲۲] مارے نین سوں[۲۳]
کے گیو[۲۴] تیرو کوکرمی[۲۵]! ٹھوڑ میں مارا پڑا
مات کھائی لات کھائی دھول جوتی اوٹ لی
ہو گیا دلمیر! توں تو اسک[۲۶] ماں چکن[۲۷] گھڑا

---

(۱) ایک دن کو کہہ کے گیا ہے۔ (۲) گزر گیا۔ (۳) بدن۔ (۴) غم نے۔ (۵) رات۔ (۶) دن۔ (۷) روئی کی طرح۔ (۸) اس کو۔ (۹) چوکھٹ۔ (۱۰) معشوق۔ (۱۱) کسی کا ہٹایا نہ ہٹے۔ (۱۲) چھینا۔ (۱۳) لڑکی۔ (۱۴) لوٹ لیا۔ (۱۵) کروٹیں۔ (۱۶) سیج پر۔ (۱۷) شام سے۔ (۱۸) صبح نکلنے تک۔ (۱۹) دیکھو۔ (۲۰) قریب۔ (۲۱) پلکوں سے۔ (۲۲) اشارے۔ (۲۳) آنکھ سے۔ (۲۴) کیا گیا تیرا۔ (۲۵) اے ظالم! یعنی مارا تو میں گیا۔ (۲۶) عشق۔ (۲۷) چکنا گھڑا۔

اسک کرے گا پھجیت[1] ہوگی اسک[2] کرے مت رے ہیرا
بوئے کھیت[3] ارنڈ کے پودا کن کھائے ککڑی کھیرا
باڈھی[4] کے نے پران گنوائے اسک لائے کے[5] سیری[6] سے
کھسرو[7] کی تو موچھ نہ کھوسی[8] آپو اپنا سر چھیرا
لیلیٰ پاچھے ہوؤ[9] باوڑا[10] مجنوں[11] کی کے مت ہینی
سگری[12] پاگ ٹوک کر لاڑی لتا سگ[13] لیرم لیرا
ہیر نمانی[14] ہوئی دوانی ، رانجھے لے کے دکھ اوٹے[15]
پیت[16] کروں پرتیت جائے ہے پیت نکرے دلمیرا !

لارے[17] کلاڑ کے پھول سراب[18]   سیسہ[19] دمکے جیسے گلاب[20]
پانو پاگ[21] کاکھ[22] میں جوتی   ایسی دارو[23] پیو زناب[24]
گھوڑے چڑھ کے چلے نسے میں   پانو پاسر[25] ، گلے رکاب
آئے صاحب جنٹل میں   ہاتھ ہتھوے[26] پانو جراب
اونچا کوٹ لمبی پتلون   یوہی مہارے بڑے نباب[27]
دارو پی کے ٹہلن لاگے   مونہہ مان چرٹ ہاتھ کتاب
توں دلمیرا جیب[28] کا پھوڑا   یا جیبا[29] نو دانتوں[30] داب

---

(۱) فضیحت - (۲) عشق - (۳) بو کر کھیت میں ارنڈ کے پودے کس نے کھایا ہے ککڑی کھیرا - (۴) بڑھئی کے بیٹے فرہاد نے - (۵) لگا کے - (۶) شیریں سے - (۷) خسرو - (۸) کھسوٹی - (۹) ہوا - (۱۰) باولا - (۱۱) مجنوں کی کیسی بودی عقل تھی - (۱۲) ساری پگڑی ٹکڑے کر ڈالی - (۱۳) لتّے سارے لیر لیر ہو گئے - (۱۴) بھولی - (۱۵) اٹھائے - (۱۶) پیت کرنے سے - (۱۷) اے کلاں والے - (۱۸) عمدہ شراب - (۱۹) بوتل - (۲۰) گلاب - (۲۱) پانو پر پگڑی - (۲۲) بغل میں جوتی - (۲۳) شراب - (۲۴) جناب - (۲۵) پانو پر سر اور گلے میں رکاب - (۲۶) دستانے - (۲۷) نواب - (۲۸) زبان کا پھوڑا - (۲۹) اس زبان کو - (۳۰) دانتوں تلے داب -

مونہہ مان بان[1] چلاوے جیب   سگڑی[2] آپھت[3] ڈھاوے جیب
یا جیبا کے سگڑے کھوٹ   بھیوں[4] راڑ[5] کراوے جیب
کدھیں[6] تو بولے امرت بول   کدھیں بکھ[7] کھنڈاوے جیب
پٹ[8] سوں بول اپاؤ[9] کے بول   تُرت پُھرت لک جاوے جیب
جیب[10] کہا ؟ تنک سی جونک   لہو ماس کھا جاوے جیب
دھرتی پا[11] لکھوں کرے بگاڑ   انبر آگ لگاوے جیب
یو ہی گیرے نرکھوں[12] کنڈ   یو ہی سُرگ[13] کماوے جیب
توں دلمیرا جیب کے بس میں   تیری کوئی کٹاوے جیب

افسوس ہے کہ اس دیوان میں جتنے اصناف کا کلام ہے ان سب کا نمونہ ہم نہیں دکھا سکتے کیوں کہ بہت سے اشعار ہزل بلکہ فحش کی حد تک پہنچ گئے ہیں - لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے ، اس میں زیادہ تر ہماری سوسائٹی کا قصور ہے - جس کے خوش کرنے اور جس سے داد لینے کے لیے شاعر کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ کہیں کہیں تہذیب کی حد سے متجاوز ہو کر سامعین کے دل کو لبھائے جائیں - یہی وہ مجبوری ہے جس نے ہماری شاعری کو گندہ اور ناپاک کر دیا ہے - لیکن اگر اس دیوان میں سے غیرمہذب اشعار نکال دیے جائیں ، تو بھی ایک معتد بہ مجموعہ مہذب اور شائستہ کلام کا باقی رہتا ہے جو صاحبِ دیوان کی ایک عمدہ یادگار ہو سکتا ہے -

---

(۱) تیر - (۲) ساری - (۳) آفت - (۴) بھائیوں میں - (۵) تکرار - (۶) کبھی - (۷) زہر - (۸) جلدی سے - (۹) فساد کے بول بول کر - (۱۰) جیب کیا ہے ذرا سی جونک - (۱۱) زمین پر - (۱۲) ڈالے نرکھ کے کھنڈ میں - (۱۳) بہشت -

۱۹

معلم الشطرنج

شطرنج پاک و ہند کے لوگوں کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور صدہا سال سے مقبول چلا آ رہا ہے۔ دہلی کے رہنے والے ایک صاحب راجا بابو کو شطرنج کی تاریخ اور اُس کی بازیوں کی تفصیل اور کھیل کے مختلف طریقوں پر ایک مستقل اور مکمل کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی تقطیع کے قریباً ۳۰۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں لکھی اور امپیریل بک ڈپو مچھلی بازار دہلی نے شائع کی۔ مولانا حالی کا یہ ریویو اُس کتاب میں سے نقل کیا گیا ہے، جو اُن کی ذاتی لائبریری میں موجود تھی۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کو بھی اس فن میں خاصی مہارت اور واقفیت تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ (محمد اسماعیل)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت جس کا موضوع فنِ شطرنج بازی ہو، اُس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون و چرا کر سکوں کیوں کہ یہ درحقیقت ایک ماہر و مشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چوں کہ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لیے ہر شخص، جو اُردو زبان کو سمجھ سکتا ہو، وہ کم سے کم اس بات کا حق رکھتا ہے کہ

مصنف کی طرز تصنیف و طرز بیان یا کتاب کے مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہم وطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں۔ مسلمان تو اس وجہ سے کہ اُن کے مذہب میں لہو و لعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور ہندو اس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کھیل کا لپکا پڑ جاتا ہے، وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج بازی پر قربان کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کو کھانے پینے بلکہ اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی۔ لیکن لعب کا اطلاق اُن کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لیے نہیں بلکہ صرف تضییع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں۔ پس شطرنج اگر خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ مآل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اُس کو بری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ جو بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے، وہ صرف اس وجہ سے قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بعضے لوگ اُسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی اور دنیوی کاموں کو مطالعے کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو چاندنی چوک بازار دہلی نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے، اُس میں سرمو مبالغہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس

طرح اکثر عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بسبب اختصار کے اُن کتابوں کی اصلی خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہو سکتیں، اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب معلم الشطرنج کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے، یعنی جب کہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جا بجا کیا گیا ہے تو مقتضاے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً اُنیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و میرزا رحیم الدین حیا و امام علی خاں وغیرہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کیے ہوئے کھیل پر لکھی جائے، اُس میں اُن کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مر گیا اُس کی بازیاں اور اُس کے نقشے بھی اُسی کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اُردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اُس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آیندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں طرح کھیلتے دیکھا ہے۔ اُس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو مات بھی ہو جاتا ہے مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اُس کی ایک بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔ اسی لیے جیسا کہ راجا بابو صاحب نے اکثر کتاب میں تصریح کی ہے، اس ملک میں فنِ شطرنج بازی روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے۔ شاید بعض نکتہ چیں اس جدید تصنیف پر ریمارک کریں کہ اگر فنِ شطرنج بازی کو غیر مفید تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس موضوع پر کتاب لکھنا اُس وقت زیبا تھا جب کہ ہمارا لٹریچر اور ہماری زبان تمام ضروری علوم و فنون سے مالا مال ہو جاتی اور مصنفین کے لیے کوئی میدان اس کے سوا باقی نہ رہتا کہ کھیلوں اور بازیوں کے قواعد منضبط کر کے ان کو کتابوں کے لباس میں جلوہ گر کریں۔ اسی قسم کا اعتراض اُس کتاب پر کیا گیا تھا جو حال ہی میں فرانس اور پروشیا کی جنگ کے بیان میں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض ترجموں کی نسبت ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ مترجم مختلف مضامین میں سے جس مضمون کو سب سے مقدم اور ضروری سمجھے، ترجمے کے لیے انتخاب کر سکتا ہے، مگر ایک اوریجنل تصنیف کے لیے کسی مضمون کا اس طرح انتخاب کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ ایسی تصنیف اُسی مضمون پر سرانجام ہو سکتی ہے، جس میں مصنف نے کم و بیش کمال حاصل کیا ہو اور اُس کی ممارست میں ایک معتدبہ حصہ عمر کا صرف کیا ہو۔ پس درحقیقت ایک اوریجنل مصنف کا یہ کام نہیں ہے کہ جو مضمون ملک کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور مفید ہو، اس پر خواہی نخواہی طبع آزمائی کرے، بلکہ براہ راست اُس کا کام یہ ہے کہ جس فن میں اُس نے کمال حاصل کیا ہے اُس میں جو کچھ تجربہ اور معلومات اُس نے بہم پہنچائی ہوں اُن کو قدیم مصنفوں کی معلومات میں شامل کر کے اُس سے ملک کو مستفید کرے۔

ہم کو آمید ہے کہ راجا بابو صاحب کی کتاب معلم الشطرنج آن تصانیف کے لیے ، جو آیندہ اس فن پر خاص کر آردو زبان میں لکھی جائیں گی ، بہ منزلہ اساس اور بنیاد کے ہوگی اور جتنی عمارتیں اس بنیاد پر چنی جائیں گی ، آن کے بانی ہونے کا فخر ہمارے لائق مصنف کو ہوگا ۔

۲۰

لکچر ”حمایت اسلام“ اور نظم ”تصویر عبرت“

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۱۸—۱۹)

یہ دونوں کتابیں نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان صاحب شروانی رئیس اعظم بھیکم پور کی تصنیف کردہ ہیں ، جو مرحوم نے مولانا حالی کو جون ۱۹۰۲ع میں بہ غرض اظہار رائے بھیجی تھیں اور مولانا نے آن پر اپنی رائے لکھ کر ۲۶ جون ۱۹۰۲ع کے خط کے ذریعے نواب صاحب کو بھیج دی تھی ۔ نواب صاحب نہایت عقیدت کے ساتھ حضرت مولانا سے پیش آتے تھے اور مریدوں کی طرح آن کا ادب کرتے تھے اور جو بھی کتاب لکھتے تھے مولانا کو ضرور بھیجتے تھے ۔ (محمد اسماعیل)

(۱)

”تصویر عبرت“ کو اول میں نے ”مخزن“ میں دیکھا تھا ، پھر ”تہذیب النسواں“ میں دیکھا اور اب لکچر کے ساتھ اس کو بھی اول سے آخر تک پھر پڑھا اور بلا تصنع ہر دفعہ اس کے پڑھنے سے لطفِ تازہ حاصل ہوا ۔ ”فالمسک ماکررتہ یتضوع“ اول تو مضمون ہی فی نفسہ موثر اور عبرت انگیز ہے اور پھر مناسب الفاظ اور خوبیٔ بیان نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے ۔ مگر شاید یہ

کبر سن کا تقاضا ہے کہ جو اثر پہلے عمدہ نظم کے پڑھنے یا سننے سے دل پر ہوتا تھا وہ بات اب نہیں رہی اور یہی وجہ ہے کہ فکرِ شعر سے اب طبیعت سو سو کوس بھاگنے لگی ہے ۔

(٢)

لکچر جس وقت میرے پاس پہنچا ، جب تک اس کو اول سے آخر تک نہیں دیکھ لیا ، اپنی جگہ سے نہیں اٹھا ۔ اگرچہ اس میں بعض خیالات ایسے ظاہر کیے گئے ہیں جن سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے ، لیکن اس بات کے خیال کرنے سے بے انتہا مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے سپیکروں اور لکچراروں میں آپ کے سبب سے ایک معقول اور قابل قدر اضافہ ہوا ہے ۔ سب سے پہلے میں نے آپ کی وہ بے مثل تقریر سنی تھی جو حاذق الملک کی یادگار کے جلسے میں بمقام علی گڑھ اسٹریچی ہال میں آپ نے کی تھی ۔ اس کے بعد اخلاقِ اسلامی پر جو لکچر آپ کا انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا ہے ، اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اب یہ لکچر جو حمایت اسلام پر آپ نے لاہور میں دیا تھا ، میری نظر سے گزرا ۔ مسلمانوں میں اول تو عموماً قحط الرجال ہے اور پھر خاص کر رؤسا کے طبقے میں تو علمی مذاق بالکل مفقود ہی ہو گیا ہے ۔ پس یہ کچھ کم خوشی اور فخر کا مقام نہیں ہے کہ ہمارے رئیسوں میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو قطع نظر اعلیٰ درجے کے علمی اور لٹریری مذاق کے مسلمانوں کا خیر خواہ اور اسلام کا حامی اور قومی کاموں میں بھی سرگرم ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جملہ مکروہات سے محفوظ رکھے اور اسلام کی خیر خواہی اور مسلمانوں کی ہمدردی سے آپ کو حظِ وافر نصیب کرے ۔ زیادہ نیاز

خاکسار ۔ نیاز مند ۔ الطاف حسین حالی ، پانی پت
٢٦ جون ١٩٠٢ع

٢١

قوانین دولت

(منقول از کتاب ''قوانین دولت'' صفحہ ٥٨)

یہ دلچسپ ، آسان اور سلیس کتاب پاربس بل کی تصنیف اور حضرت آستاذی المحترم جناب مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم پانی پتی کی مترجمہ ہے ۔ حضرت موصوف نے اس کا ترجمہ اس وقت کیا تھا جب آپ گلبرگہ (دکن) میں اپنے بھائی خواجہ غلام الثقلین کی بجائے انسپکٹر تعلیمات تھے ۔ حضرت موصوف میں ترجمے کی عجیب و غریب قابلیت تھی ۔ وہ عربی ، فارسی ، ہندی ، سنسکرت اور انگریزی سے بے تکان اور بڑی روانی کے ساتھ نہایت سلیس اور آسان زبان میں ترجمہ کر سکتے تھے ۔ ''فلسفۂ تعلیم'' ہربرٹ سپنسر اور ''تحقیق الجہاد'' نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور ''سرّ الشہادتین'' حضرت شاہ عبدالعزیز رحمة اللہ علیہ ان کے ترجموں کے شاہکار ہیں ۔ وہ ترجمے کو اصل سے بہت زیادہ مفید بنا دیا کرتے تھے ۔ ذیلی سرخیاں اور بغلی عنوانات بکثرت خود قائم کرتے ، فقرے بہت چھوٹے چھوٹے لکھتے ، الفاظ نہایت آسان لاتے اور خالص علمی کتابوں میں بھی سلاست کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ پھر مفید اور ضروری حواشی سے کتاب

کی افادیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا کرتے تھے۔ مولانا حالی کے نواسے اور خواجہ غلام السیدین ریٹائرڈ ایجوکیشنل سکرٹری گورنمنٹ ہند کے ماموں تھے۔ صورت اور سیرۃ دونوں پاکیزہ تھیں۔ آریہ سماج سے بحث و مناظرہ کا خاص ذوق رکھتے تھے اور برابر آریہ سماج کے نامی گرامی اپدیشکوں سے کامیاب مناظرے کرتے رہتے تھے۔ تعلیم کے بہت بڑے ماہر تھے اور بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے انھوں نے بہت ہی دلچسپ چارٹ بنائے تھے۔ نہایت شیریں گفتار، بلند پایہ مقرر اور نہایت خوش بیان ذاکر تھے اور اس شوق میں بقول مولانا حالی ”دور دور کے دھاوے مارتے تھے“۔ قریباً ساری عمر تجرد کی حالت میں گزار دی اور عروس ادب سے شادی کرکے پچاس سے زیادہ اولادیں اپنے پیچھے چھوڑ کر ۲۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو انتقال کیا اور پانی پت کی ایک باغیچی میں سپرد خاک ہوئے۔

بارس بل کی یہ کتاب، جس کا حضرت خواجہ صاحب نے ترجمہ کیا، پولٹیکل اکانومی (سیاست مدن) سے تعلق رکھتی ہے جس میں اس فن کے ابتدائی اصول نہایت شگفتگی اور سلاست کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت حضرت خواجہ صاحب نے اس فن کے متعلق بعض مفید مضامین کا اضافہ بھی اس کتاب میں کر دیا ہے اور اب یہ پولٹیکل اکانومی کے طلباء کے لیے بڑی اہم اور مفید کتاب بن گئی ہے۔ مولانا حالی نے یہ ریویو اس کتاب پر اسی وقت لکھا تھا جب اکتوبر ۱۹۰۳ء میں یہ کتاب ترجمہ ہو کر چھپ رہی تھی۔

(محمد اسماعیل)

میں نے رسالہ ”قوانین دولت“ کو اول سے آخر تک بہ نظرِ غور دیکھا ؛ اگرچہ پولٹیکل اکانومی میں اب سے پہلے متعدد کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں مگر اب تک شاید کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا جو مدارس کی درمیانی جماعتوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق ہو اور نیز عام اردو داں بھی اس کے مضامین سے مستفید ہو سکیں۔

اردو میں یہ رسالہ دو وجہ سے امتیاز رکھتا ہے ؛ اول تو مترجم نے ترجمے کے لیے ایسی کتاب انتخاب کی ہے جس میں مصنف نے اس فن کی ابتدائی مگر نہایت اہم اور ضروری باتوں کے بیان پر اکتفا کیا ہے، اور ایسے دقیق مسائل سے کچھ تعرض نہیں کیا جو عام ذہنوں سے بالاتر ہوں۔ دوسرے خود مترجم نے، جو انگریزی کے سوا عربی، فارسی اور اردو میں بھی عمدہ لیاقت رکھتے ہیں، اس بات میں نہایت کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ترجمہ با محاورہ اور فصیح اردو میں ہو اور بیان میں کسی قسم کی گنجلک یا الجھاؤ باقی نہ رہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس رسالے کی اشاعت سے مصنف اور مترجم دونوں کا مقصد بخوبی حاصل ہوگا اور یہ کتاب متوسط درجے کی استعداد والوں کے لیے، جو اس فن سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں، بہ منزلہ رہنما کے ثابت ہوگی۔

۲۲

سیاقِ دکن

(منقول از کتاب 'سیاق دکن'، مطبوعہ ۱۳۱۳ فصلی
مطابق ۷ - اپریل ۱۹۰۴ ع)

خاندانِ عباسیہ، سلاطینِ ہند اور شاہانِ دکن کے دفتروں میں حساب کتاب کا جو طریقہ رائج رہا تھا، اس عجیب و غریب کتاب میں اُس کی تمام تفاصیل نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ درج کی گئی ہیں - $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$ کی تقطیع پر ۱۶۶ صفحات کی کتاب ہے مگر ان مختصر سے صفحات میں مولفِ کتاب نواب عزیز جنگ بہادر نے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے - یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۱۳ فصلی میں چھپی اور شائع کرنے سے پہلے مصنف نے مولانا کی خدمت میں اظہار رائے کے لیے بھیجی تھی - جب مولانا نے اسی پر رائے لکھ کر بھیج دی تو مصنف نے کتاب کے ساتھ شامل کرکے اُسے شائع کر دیا - مولانا شبلی سے بھی اسی طرح مصنف نے رائے حاصل کی تھی اور وہ بھی کتاب کے ساتھ ہی شائع ہوئی تھی - (محمد اسماعیل)

جو محنتِ شاقہ نواب عزیز جنگ بہادر نے اس کتاب کی تالیف میں برداشت کی ہے، وہ اس کے ایک ایک صفحہ بلکہ ایک ایک لفظ

سے ظاہر ہوتی ہے اور میرے نزدیک جو کچھ اس کتاب کی نسبت شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے تحریر فرمایا ہے، اُس میں سرمو مبالغہ نہیں ہے - امید ہے کہ جناب مولف کی سعی مشکور ہوگی اور یہ بے نظیر تصنیف قبولِ عام کا درجہ حاصل کرے گی -

الطاف حسین حالی
۱۷ اپریل ۱۹۰۴ع

۲۳

فلسفۂ تعلیم

(منقول از فلسفۂ تعلیم ، مطبوعہ ۱۹۰۳ع)

ہربرٹ سپنسر انگلستان کا ایک بہت مشہور فلاسفر اور مفکر گزرا ہے ، جس کے متعلق اہل انگلستان کا خیال ہے کہ اگر آج ارسطو زندہ ہوتا اور اپنی پچھلی دو ہزار سال کی تمام علمی ترقیوں سے بھی واقف ہوتا ، تب بھی علم و فضل میں ہربرٹ سپنسر کے برابر نہ ہوتا ۔ اسی ہربرٹ سپنسر نے ایک بے نظیر کتاب ایجوکیشن (Education) کے نام سے لکھی ہے ۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا اردو میں ترجمہ کرانا چاہا تو استاذی المحترم جناب مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم پانی پتی انسپکٹر تعلیمات گلبرگہ کو اس کام کے لیے انتخاب کیا ، جنھوں نے نہایت درجہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ۔ حواشی اور ذیلی عنوانات نے کتاب کی افادیت اور حسن کو چارچاند لگا دیے ہیں ۔ کتاب ۳۰۰ صفحات پر ۱۹۰۳ع میں چھپی تھی اور بعد میں بھی کئی مرتبہ چھپ چکی ہے ۔ مولانا حالی کا یہ ریویو کتاب کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ ہی اس کے آخر میں شائع ہوا تھا ۔

(محمد اسماعیل)

میں نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ سپنسر مرحوم کی بے مثل کتاب ”ایجوکیشن“ کا ترجمہ جو ”انجمن ترقی اردو“ کی فرمائش سے مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے ، مختلف مقامات سے خود بھی دیکھا اور مترجم موصوف نے بھی اس کا بہت بڑا حصہ مجھے پڑھ کر سنایا اور جس احتیاط اور صبر کے ساتھ انھوں نے اس ترجمے کو پورا کیا ہے اس سے بھی میں بخوبی واقف ہوں ۔

اگرچہ اس ترجمے کی نسبت ، جو انگریزی سے اردو زبان میں کیا گیا ہے ، ایک ایسا شخص جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہو ، رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا ، لیکن وہ اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے مصنف کے عمیق و دقیق خیالات کو کہاں تک اردو داں پبلک کے فہم کے لائق کر دیا ہے اور جس زبان میں اصل کتاب کے مضامین ادا کیے گئے ہیں ، وہ کہاں تک سائنس کے بیان کے لیے موزوں اور مناسب ہے ۔ میرے نزدیک ان دونوں باتوں کے لحاظ سے مترجم کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے ۔ جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے ترجمے کی تکمیل اور زبان کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن کی امیدوں سے بمراتب بڑھ کر عرق ریزی و جان فشانی کی ہے ۔

در حقیقت یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن کو اس کتاب کے ترجمے کے لیے ایک ایسا شخص مل گیا جو قطع نظر انگریزی ، عربی اور فارسی کی جامعیت کے ، فطرۃً علمی مشاغل پر فریفتہ اور اپنے فرائض کو عاشقانہ دلچسپی اور شغف کے ساتھ انجام دینے والا ہے ۔ فقط

۲۴

مشیرِ نسواں

(منقول از ناول 'مشیر نسواں' مصنفہ صغرا ہمایوں مرزا ، صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲)

صغرا بیگم بنت ڈاکٹر حاجی صفدر علی مرزا ایک بہت لائق اور قابل خاتون تھیں ، جو حیدر آباد دکن کے ایک قدیم اور معزز خاندان میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئیں ۔ بڑے ہو کر اُن کی شادی پٹنہ کے مشہور بیرسٹر سید ہمایوں مرزا سے ہوئی جس کے بعد اُنھوں نے اپنا نام صغرا ہمایوں مرزا رکھ لیا ۔ شادی ہونے پر ہمایوں مرزا نے پٹنہ چھوڑ دیا اور بیوی کی خاطر مستقل طور پر حیدر آباد کی سکونت اختیار کر لی ۔ صغرا بیگم کو بچپن سے علم کا شوق اور تصنیف و تالیف کا ذوق تھا ۔ شاعری سے بھی طبیعت کو بڑا لگاؤ تھا ۔ شوہر قدردان ملا اس لیے صغرا بیگم نے اپنے سارے شوق پورے کیے ۔ شعر میں جلیل کی شاگردی اختیار کی اور حیا تخلص رکھا ۔ تصنیف و تالیف میں بھی نمایاں حصہ لیا اور پندرہ کے قریب کتابیں لکھیں ۔ عورتوں کی اصلاح و فلاح کے لیے ''النساء'' حیدر آباد دکن سے اور ''زیب النساء'' لاہور سے جاری کیے جن کی وہ مدت تک ادارت کرتی رہیں ۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مدرسۂ صفدریہ قائم کیا اور نہایت ایثار کے ساتھ

اپنی جائداد کا ایک حصہ اُس کے لیے وقف کر دیا ۔

۱۹۵۹ء میں انتقال کیا ۔

۱۹۰۵ء میں اپنے جشن چہل سالہ کی روئداد لکھنے کے لیے میر محبوب علی خاں والیِ دکن نے مولانا حالی کو حیدر آباد بلایا تھا ۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں ایک روز صغرا ہمایوں مرزا مولانا کے پاس نظام کلب میں تشریف لائیں ، جہاں مولانا بحیثیت شاہی مہمان مقیم تھے اور اپنا نو تصنیف ناول ''مشیر نسواں'' کا مسودہ بہ غرض اصلاح و اظہار رائے مولانا کی خدمت میں پیش کیا ۔ یہ وہی رائے ہے جو میں آج ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔

اُس وقت تک یہ کتاب چھپی نہیں تھی ۔ جب بعد میں صغرا ہمایوں مرزا نے اسے شائع کیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کی اس رائے کو کتاب کے صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲ پر نقل کر دیا ۔

مجھے اس ریویو کا قطعاً پتا نہیں تھا کیوں کہ نہ یہ کتاب مولانا حالی کی لائبریری میں تھی اور نہ مجھے کہیں اور سے اس پچاس برس کے عرصے میں ملی ۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں اپنے محترم دوست پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی کا کہ اُنھوں نے اس ریویو کی نقل مجھے حیدر آباد دکن سے بھیج دی ۔

''مشیر نسواں'' کے علاوہ صغرا ہمایوں مرزا کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں :

تحریر النساء ، سفینۂ نجات ، سفرنامۂ عراق ، سفرنامۂ پونا و مدراس ، سیر بہار و بنگالہ ، مجموعۂ نصائح ، مقالات صغرا ، روزنامچۂ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی ،

بعد غلام الحسنین[1] نے مانگ لی ۔ آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ''من عرف منزلتکم فی التصنیف کل لسانہ''، آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے ۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ سلامت رکھے ۔

---

[1] حضرت مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم انسپکٹر تعلیمات گلبرگہ و مترجم فلسفۂ تعلیم ہربرٹ سپنسر جو مولانا کے نواسے تھے ۔

۲۶

تبصرہ بر مضمون
''علی گڑھ کالج کی شورش''

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۷۱-۷۲)

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ مضمون جولائی ۱۹۰۷ع میں لاہور کے پیسہ اخبار میں شائع کر دیا تھا ۔ مضمون پڑھ کر مولانا نے مولوی عبد الحق صاحب کو اس پر جو تبصرہ کرکے بھیجا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

آپ کا آرٹیکل ، جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے ، میں نے کئی دفعہ پڑھا ۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی . . . . کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا ، آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا ۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے ، وہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا ذکر ہے ۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بد صورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کسیں اور قہقہے لگائیں تو بد صورت کے لیے اس ندامت سے بچنے کا عمدہ گُر یہ ہے کہ وہ بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جائے ۔ چوں کہ میں بھی ننگِ ٹرسٹیاں ہوں اس لیے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہوں ۔ میں نے اس باب میں کمیشن کے پریسیڈنٹ صاحب

ہر ایک کام کو سرگرمی اور شوق سے کرنا ، تحمل اور بردباری ، وقت کی قدر کرنی ، جز رسی اور کفایت شعاری ، ان سب باتوں کی تعریف اور بے سلیقگی ، فضول خرچی ، بے پروائی ، تضییع اوقات ، نا عاقبت اندیشی ، بازاری عورتوں کی بات پر یقین کر لینا ، بے سوچے سمجھے دوسروں کی تقلید کر بیٹھنا ، شوہروں کے آرام و آسائش کا کچھ خیال نہ کرنا وغیرہ وغیرہ ، ان خصلتوں کے مضر نتیجے پردے ہی پردے میں بیان کر گئی ہیں ۔ اس کے سوا بعض نہایت مفید اطلاعیں جیسے جغرافیہ دانی کے فوائد ، قریب کے رشتہ داروں میں ازدواج ہونے کے نقصانات ، حفظ صحت کے قواعد اور اسی طرح کی اور سود مند باتیں قصے کے ضمن میں جا بجا بیان کی ہیں جو کم سے کم فرقۂ نسواں کے لیے بالکل نئی معلومات میں داخل ہیں ۔ زبان اول سے آخر تک بہت شستہ اور صاف ہے اور طرز بیان موثر اور دل چسپ ۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جو اب تک شائع نہیں ہوئی ، بعد اشاعت کے ملک میں مقبول اور خاص کر فرقۂ نسواں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی ۔

راقم
الطاف حسین حالی
مقام حیدر آباد دکن ، نظام کلب

انجمن ترقی اردو

۲۵

سوانح مولانا روم

(مکاتیب حالی ، صفحہ ۳۹ ، ۴۰)

مولانا جلال الدین رومی کی سوانح عمری مولانا شبلی نعمانی نے ۱۹۰۴ع میں لکھ کر ختم کی ۔ اس وقت ملک کا سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ لیتھو کا چھاپہ خانہ کان پور کے منشی رحمت اللہ رعد کا نامی پریس تھا ۔ تمام اعلیٰ پایے کی علمی اور ادبی کتابیں اُن ہی کے ہاں چھپا کرتی تھیں ۔ چناں چہ اعلیٰ طباعت و کتابت کی توقع میں مولانا نے اس کتاب کا مسودہ ختم ہوتے ہی منشی رحمت اللہ رعد کو بھیج دیا اور ساتھ خط لکھ دیا کہ جس قدر جلد سے جلد ممکن ہو سکے اسے چھاپ دو ۔ مگر رعد نے اسے ڈالے رکھا ، یہاں تک کہ وہ ۶ اگست ۱۹۰۶ع کو چھپ کر مطبع سے آئی ۔ کتاب کے آتے ہی مولانا شبلی نے ایک جلد مولانا حالی کی خدمت میں ہدیۃً بھیجی جس پر شبلی کو حالی نے لکھا :

(محمد اسماعیل)

’’سوانح مولانا روم کو اب تک میں ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں ۔ اول مولوی وحید الدین[1] دیکھنے کو لے گئے ۔ اُن کے

---

[1] مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم لٹریری اسسٹنٹ سرسید احمد خاں ، جو مولانا کے دوست تھے ۔

بعد غلام الحسنین[1] نے مانگ لی ۔ آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ”من عرف منزلتکم فی التصنیف کل لسانہ“ آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے ۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ سلامت رکھے ۔

---

[1] حضرت مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم انسپکٹر تعلیمات گلبرگہ و مترجم فلسفۂ تعلیم ہربرٹ سپنسر جو مولانا کے نواسے تھے ۔

۲۶

تبصرہ بر مضمون

”علی گڑھ کالج کی شورش“

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۷۱-۷۲)

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ مضمون جولائی ۱۹۰۷ء میں لاہور کے پیسہ اخبار میں شائع کر دیا تھا ۔ مضمون پڑھ کر مولانا نے مولوی عبدالحق صاحب کو اس پر جو تبصرہ کرکے بھیجا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

آپ کا آرٹیکل ، جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے ، میں نے کئی دفعہ پڑھا ۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی . . . . کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا ، آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا ۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے ، وہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا ذکر ہے ۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بد صورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کسیں اور قہقہے لگائیں تو بد صورت کے لیے اس ندامت سے بچنے کا عمدہ گُر یہ ہے کہ وہ بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جائے ۔ چوں کہ میں بھی ننگِ ٹرسٹیاں ہوں اس لیے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہوں ۔ میں نے اس باب میں کمیشن کے پریسیڈنٹ صاحب

کو لکھ بھیجا ہے کہ نکمے اور نالائق ٹرسٹیوں کی بھرتی در حقیقت سرسید کے وقت میں شروع ہوئی تھی ۔ انھوں نے کالج کی وقعت بڑھانے کے لیے اور نیز اس لیے کہ ان کے دور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں ، ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا تھا ، جن سے مالی امداد کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکرٹری سے کسی معاملے میں اختلاف کرنے کا نہ ان میں مادہ ہو اور نہ ارادہ ۔ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہی لوگ ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور آج تک اسی اصول پر ٹرسٹیوں کا انتخاب ہوتا رہا ۔ میں نے ان کو یہ بھی لکھا ہے کہ کمیشن کو چند ریزولیوشن ایسے بھی پاس کرنے چاہئیں ، جن سے موجودہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا انسداد ہو اور آیندہ کسی عمدہ اور مستحکم اصول سے ان کا انتخاب عمل میں آیا کرے ۔

آپ کے لاجواب آرٹیکل کو میں مسیح کے ”سرمن آن دی مونٹ“ سے تشبیہ دیتا ہوں کہ اس میں صداقت اور نیکی اور ہمدردی سب کچھ ہے ، مگر قابل عمل نہیں ۔ اور شاید کم سے کم پچاس برس تک ایسا ہی ناقابل عمل رہے گا ۔ یہ باتیں آپ جبھی تک کہہ سکتے ہیں جب تک کالج سے عملاً کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔ ورنہ آپ کو بھی وہی کرنا پڑے گا جو آنریری سکرٹری اور ان کے دیگر اعوان و انصار کر رہے ہیں ۔

۲۷

فرہنگِ حامدیہ

(رسالہ 'آج کل' دہلی ، جلد ۱۰ ، نمبر ۱۰ ،
بابت ماہ مئی ۱۹۵۳ع ، صفحہ ۲۲ - ۲۳)

آردو کی یہ ایک نہایت طول طویل اور مفصل و مکمل لغت تھی جو ۱۹ ضخیم جلدوں میں ایک بڑے فاضل شخص مولوی عبد المجید خاں رام پوری نے سال ہا سال کی تلاش و جستجو اور سارے ملک کے معروف شہروں کے متعدد چکر لگانے کے بعد اور اپنا سارا اثاثہ اور ساری جمع پونجی قربان کرکے تیار کی تھی ۔ اس میں فاضل مصنف نے انتہائی محنت و کاوش کے بعد آردو کے ۳۰ ہزار مصادر مرکبہ اصطلاحیہ مع اشعار سند اور دو لاکھ سے زیادہ الفاظ مستعملہ کا بے نظیر ذخیرہ جمع کیا تھا ۔ جب سارے ہندوستان کا چپہ چپہ چھاننے کے بعد واپس ۱۹۱۸ع میں رام پور آئے تو نواب حامد علی خاں فرماں روائے ریاست رام پور نے آن کی اس لغت کا شہرہ سن کر نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں دربار میں طلب کیا اور آن سے آن کی لغت کے متعلق دریافت فرمایا ۔

خاں صاحب نے آنیس کی آنیس جلدیں لا کر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیں ۔ اعلیٰ حضرت نے کتاب کو دیکھ کر نہایت پسند کیا اور حکم دیا کہ

> کتاب شاہی کتب خانے میں داخل کر دی جائے اور فوراً اس کی طباعت کا انتظام کیا جائے ۔ لیکن نواب صاحب موصوف کا انتقال ہوگیا اور یہ لغت طبع نہ ہوسکی ۔ خدا جانے اس کے مسودے کا کیا حشر ہوا ۔
>
> کتاب ھذا کے لائق اور فاضل مولف اس کتاب کے سلسلے میں دو مرتبہ ، پہلی دفعہ ۱۹۰۵ع میں اور دوسری بار ۱۹۰۸ع میں ، پانی پت مولانا حالی کے پاس آئے اور عرض کی کہ اس کے متعلق دو جملے لکھ دیں ۔ مولانا نے دونوں مرتبہ اُن کی خواہش کے مطابق نہایت عمدہ الفاظ میں کتاب پر تبصرہ کردیا ۔ ۱۹۰۵ع کا ریویو جو بہت مختصر تھا ، مجھے نہیں ملا ؛ البتہ ۱۹۰۸ع کا تبصرہ اتفاقاً رسالہ ''آج کل'' دہلی میں سحر رام پوری صاحب کا بھیجا ہوا مل گیا ۔ جو اس کے مئی ۱۹۵۳ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔ سحر رام پوری صاحب کو یہ ریویو یونس الرحمان خاں صاحب نے اشاعت کے لیے دیا تھا ۔
>
> یونس الرحمان خاں مولوی عبدالمجید خاں صاحب مرحوم مولفِ ''فرہنگ حامدیہ'' کے بھتیجے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

مولفِ کتابِ مذکور جولائی ۱۹۰۵ع میں پہلی بار پانی پت میں آکر مجھ سے ملے تھے اور فرہنگ مذکور کے مسودات ، جو اُس وقت کتاب کی صورت میں ایک حد تک مکمل ہو چکے تھے ، اُنھوں نے مجھے دکھائے ۔ اب دوسری بار فروری ۱۹۰۸ع میں اُن مسودات کو بہت کچھ اضافے کے بعد وہ اپنے ساتھ لے کر خاکسار کے پاس پھر تشریف لائے ہیں اور مجھ سے خواہش کی ہے کہ اس مفید اور نہایت مفید کتاب پر اپنی رائے لکھوں ۔ اگرچہ ۱۹۰۵ع میں جو ایک مختصر رائے اس تالیف کی نسبت میں لکھ چکا ہوں ، اس میں اختصار کے ساتھ مولف موصوف کی مساعی جمیلہ اور کتاب کے محاسن کے متعلق بقدر ضرورت لکھا جا چکا ہے ، لیکن چوں کہ اس مدت میں انھوں نے اس کی تکمیل کے لیے دور و دراز سفر کیے ہیں اور اس مقصد کے لیے سخت تکالیف اٹھائی ہیں اور اپنے فرائض کو بے مثل کوشش کے ساتھ ادا کیا ہے ، اس لیے میرے نزدیک بھی وہ پہلی مختصر رائے کافی نہیں ۔

اگرچہ اس فرہنگ کو تمام و کمال مجھے دیکھنے کی فرصت نہیں ملی ، لیکن جس قدر مقامات مولف موصوف نے مجھے خود پڑھ کر سنائے ، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصادرِ مرکبہ کے تفحص اور استقراء میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا ۔ جو فرہنگیں یا ڈکشنریاں اس سے پہلے لکھی جا چکی ہیں ، ان کو مصادرِ مرکبہ کے لحاظ سے اس فرہنگ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی ۔ خصوصاً اساتذہ کے کلام سے ہر محاورے یا مصدرِ مرکب پر سند بہم پہنچانے میں مولف نے فوق العادت کوشش اور دماغ سوزی کی ہے ۔ حق یہ ہے کہ سند کے اشعار اہل زبان کے دواوین اور مثنویات اور ہر قسم کے نظم و نثر سے بہم پہنچانا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ تھا جس کا طے کرنا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا ۔ مولف کو اس کام کے سر انجام کرنے کے لیے صرف دماغی محنت اور جسمانی تکالیف کے اٹھانے ہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک مدت دراز تک ، جس کی میعاد تقریباً سولہ برس ہوتی ہے ، سفرِ دور و دراز کے اخراجات اور اپنے اور اپنے متعلقین کے مصارفِ خور و نوش کے لیے زر خطیر کی ضرورت تھی ۔ چناں چہ جو کچھ سرمایہ از قسم نقد و جنس ان کے پاس تھا ، وہ سب اس کتاب کی نذر ہو گیا ۔

سب سے پہلے ۱۳۰۹ھ میں مولف نے قریب پانچ برس دہلی

میں قیام کیا ، کیوں کہ زبانِ اُردو کا اصل منبع دہلی ہے ۔ جب سرمایہ بالکل خرچ ہو گیا اور کتاب کی تکمیل میں بہت کچھ کرنا باقی تھا ، دہلی سے اُٹھ کر جہاں جہاں دوست ، احباب اور کتابوں کا ذخیرہ تھا ، وہاں وہاں جا کر دو دو چار چار ماہ قیام کیا ۔ علی گڑھ ، آگرہ ، بلند شہر تھوڑے تھوڑے دن قیام کر کے لکھنؤ کا ارادہ کیا اور وہاں کے مشاہیر سے مل کر اپنی کوشش کی داد لی اور جس قدر اساتذہ کا کلام وہاں میسر آیا اس سے سند کے اشعار بہم پہنچائے ۔ پھر پنجاب کا سفر کیا ۔ میرٹھ ، مظفر نگر ، انبالہ سے گزرتے ہوئے لاہور پہنچے ، پھر وہاں سے پانی پت ۔

بلند شہر کی راہ سے بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کی خدمت میں جا کر اُن کے کتب خانے میں کئی مہینے تک کام کیا ۔ اس کے بعد دیگر قصبات و قریات میں جہاں دواوینِ اُردو کا سراغ لگا ، وہاں جا کر ان سے استفادہ کیا ۔ اس کے بعد حیدر آباد پہنچ کر ایک سال چھ ماہ تک مرزا سراج الدین احمد خاں اور مولوی عبدالحق بی ۔ اے کی اعانت سے کتاب کو بہ ہمہ وجوہ تیار اور مکمل کر دیا جو تیس ہزار مصادرِ مرکبۂ اصطلاحیہ اور اشعارِ سند پر مشتمل ہے ۔

مولف موصوف نے بہ مقابلہ دیگر فرہنگوں کے یہ بہت بڑا کام کیا ہے کہ حتی الامکان ہر لفظ یا محاورے یا مصدرِ مرکب کی سند میں دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کے اساتذہ کے کلام سے استناد کیا ہے اور صرف غزلیات کے دواوین پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھنؤ کے تمام نام ور مرثیہ گویوں کا کلام سند کے اشعار بہم پہنچانے کے لیے اول سے آخر تک مطالعہ کیا ہے ۔

اب یہ کتاب بہ ہمہ جہت مرتب ہو چکی ہے اور وہ وقت آگیا ہے کہ اس کو چھپوا کر شائع کیا جائے ، لیکن حالتِ موجودہ میں اس کا چھپوانا اور ملک میں شائع کرنا مولف کی استطاعت سے باہر ہے ۔ اس کام کے لیے جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے ، کئی ہزار روپے کی ضرورت ہے ۔ اگرچہ امید واثق ہے کہ چھپ جانے کے بعد ملک میں اس کتاب کی بہت قدر ہوگی اور مولف کی کوشش کا ثمرہ اُن کو خاطر خواہ ملے گا ، مگر جب تک کتاب مسودے کی صورت میں ہے اور ملک میں عام طور سے شائع نہیں ہو لیتی ، اس وقت تک مولف کی محنت اور جاں فشانی کی داد ملنی ممکن نہیں ۔

افسوس ہے کہ ہمارے رؤساے ذی اختیار جو ایسے مفید کاموں کی بہت کچھ قدر کر سکتے ہیں ، ایسے امور سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتے ورنہ ایک متوسط درجے کا رئیس اس کو طبع کرانے اور شائع کرنے کا بہ آسانی متکفل ہو سکتا ہے ، مگر ہم کو اُمید ہے کہ ہندوستان کے متوسط الحال لوگ جن کے علم و فضل اور لیاقت پر اس ملک کو فخر ہے ، اس کتاب کے چھپوانے اور اس کے شائع کرانے میں مولف کی معقول امداد کریں گے ، کیوں کہ ہندوستان میں اگر کچھ ملک کی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے تو اسی متوسط درجے کے طبقے سے ہو سکتی ہے اور جو کچھ اب تک ہمارے ملک کی بھلائی کے لیے ظہور میں آیا ہے ، وہ انھیں لوگوں کی امداد و اعانت سے ظہور میں آیا ہے :

ملک کو ہے آس جِس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جاں آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
تم ہمارے کام آؤ ، ہم تمھارے کام آئیں
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

مجھے امید ہے کہ ہمارے اہلِ وطن ، جو اس کتاب کے مسودے کو دیکھیں گے ، وہ ضرور تسلیم کریں گے کہ یہ کتاب جس قدر جلد شائع ہو ، بہتر ہے ۔

خاکسار ، الطاف حسین حالی ، ۱۰ فروری ۱۹۰۸ع

۲۸

گلدستۂ اخلاق

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۸۹)

یہ کتاب حضرت مولانا کے ایک ہم وطن لالہ رگھوناتھ سہائے بی ۔ اے کی تصنیف ہے ، جن کی ساری عمر تقسیم کے وقت تک لاہور میں گزری اور جو یہاں سناتن دھرم ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور بچوں کے اخبار ’گلدستہ‘ کے ایڈیٹر تھے ۔ طلباء اور اساتذہ کے لیے بھی ایک ماہنامہ ’رفیق التعلیم‘ نکالا کرتے تھے اور مذہباً برہمو سماج سے تعلق رکھتے تھے ۔ تقسیم ملک کے بعد سولن (شملہ) چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا ۔ حضرت مولانا نے ’گلدستۂ اخلاق‘ کے متعلق یہ رائے انھیں ایک خط میں لکھی تھی جو ۲۵ فروری ۱۹۰۸ع کو آپ نے آن کے نام لاہور میں بھیجا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

گلدستۂ اخلاق کی ایک جلد اور آپ کا محبت نامہ پہنچا ۔ مجھے ایک عرصے سے آنکھوں کی طرف سے شکایت ہے ۔ لکھنے پڑھنے سے بہت گھبراتا ہوں ۔ جتنے اخبار اور رسالے آتے تھے ، تقریباً سب بند کر دیے ہیں ۔ اکثر کتابوں کے پیکٹ ، جو بہ طور سوغات کے آتے تھے ، بغیر دیکھے واپس کر دیتا ہوں ۔ اگر آپ کا خط کتاب کے ساتھ ساتھ نہ پہنچتا اور آپ کا نام پہلے معلوم نہ ہو جاتا تو یہ پیکٹ بھی شاید واپس کر دیا جاتا ، مگر خوش قسمتی سے آپ کا خط اول

نظر سے گزر گیا ۔ میں نے فوراً کتاب کو کھول کر دیکھا حق یہ ہے کہ آپ نے نہایت مفید کتاب لکھی ہے اور اپنے تمام ہم وطنوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے گا ۔ یہ مختصر رسالہ ہندوستان کی ہر ایک قوم کی اولاد کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگا ۔ بیان کا طریقہ بہت پسندیدہ اور زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے ۔ البتہ کہیں کہیں محاورہ اور روزمرہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے ۔ سو اس ایڈیشن میں تو کچھ تغیر تبدل نہیں ہو سکتا ۔ لیکن میں جہاں تک ممکن ہوگا ، دوسرے ایڈیشن کی نوبت پہنچنے تک جو لفظ خلافِ روزمرہ کے دیکھوں گا ، حاشیے پر دوسرا لفظ اُس کی جگہ بدل دوں گا ۔ اگرچہ میں نہایت عدیم الفرصت اور مکروہاتِ خانگی میں مبتلا ہوں ، مگر اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا ۔[1]

---

[1] لالہ رگھو ناتھ سہائے کی ایک دوسری کتاب ”خاتونانِ ہند“ پر مولانا نے خود بھی ریویو کیا ہے اور مولانا عبدالحق کو اس پر ریویو کے لیے لکھا بھی ہے ۔ یہ ریویو علیحدہ درج ہے ۔ (محمد اسماعیل)

۲۹

”اعجاز عشق“ اور ”کارنامۂ دانش“

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۹۳ و ۹۴)

مولانا شاطر مدراسی ، جن کا نام محمد عبدالرحمان تھا اور جو خان بہادر مولوی محمد عبدالغنی المتخلص بہ امیر رئیس اعظم مدراس کے فرزند تھے ، انھوں نے اپریل ۱۹۰۸ع میں اپنے دو قصیدے ’اعجاز عشق‘ اور ’کارنامۂ دانش‘ حضرت مولانا حالی کی خدمت میں ارسال کیے اور ان سے ان پر اظہار رائے کی درخواست کی ۔ مولانا نے ان قصائد پر دو مرتبہ جو رائے لکھ کر ان کو بھیجی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

(۱)

نہایت تعجب ہوا کہ احاطۂ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو ، ایسی پاکیزہ نظم و نثر اور ایسا لطیف اور صحیح مذاق کیوں کر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا ؟ آپ کے اشعار میں یقیناً میں وہ چیز پاتا ہوں جو ترقی کر کے کمال شاعری کے درجے تک پہنچ سکتی ہے ۔ بلا مبالغہ و بلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کیوں یہ پیرایۂ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا ۔

علی الخصوص اس شعر کی تعریف مجھ سے نہیں ہو سکتی :

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

یہی ایک شعر اعلیٰ درجے کی قابلیتِ شاعری پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے ۔

(۲)

میں نے دونوں قصیدوں (اعجاز عشق و کارنامۂ دانش) کو بہت دل بستگی کے ساتھ دیکھا اور بعد مطالعے کے جو بات دل پر نقش ہوئی ہے ، وہ یہ ہے کہ فی الواقعہ آپ فطرۃً شاعر پیدا ہوئے ہیں اور اس صناعت کی قابلیت آپ میں خداداد ہے ۔ اس فن کی تکمیل آپ کے اور صرف آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس قابلیت کی قدر نہ کرنا اور اس سے بے اعتنائی برتنا میرے نزدیک من جملہ ان گناہوں کے ہے جو نا قابل عفو ہیں ۔

اس زمانے میں شاعری نہ ذریعۂ معاش ہے اور نہ اس کی پوری پوری داد ملنے کی توقع ہے ، بلکہ ممکن ہے کہ تمام عمر داد نہ ملے ، اور یہ دونوں باتیں طبیعت کی افسردہ کرنے والی اور دل کی بجھانے والی ہیں ۔ مجھے خوف ہے کہ موجودہ زمانے کی نا قدر دانی سے آپ اب یا آیندہ اس مشغلے سے جی نہ چھوڑ بیٹھیں اور اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہ جائیں ، جس کی نسبت دعاے ماثور میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ ”اللھم افردنی لما خلقتنی لہ“ مگر میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس خداداد قابلیت کو رائگاں نہ جانے دیں ۔ مجھے امید ہے کہ اس سے نہ صرف آپ کے حق میں بلکہ خود اردو لٹریچر کے حق میں عمدہ نتائج پیدا ہوں گے ۔

۳۰

خاتونانِ ہند

(مکتوبات حالی ، جلد اول ، صفحہ ۸۲ - ۸۴)

یہ کتاب مولانا کے ایک ہم وطن لالہ رگھو ناتھ سہائے ایڈیٹر رفیق التعلیم اور گلدستہ نے ۱۹۰۸ع میں لاہور سے شائع کی تھی ۔ اگرچہ مصنف کے متعلق مولانا کا خیال اس سے پہلے بہت اچھا تھا مگر اس کتاب میں اُس نے ایسے فرقہ وارانہ تعصب کا اظہار کیا تھا کہ اُسے پڑھ کر مولانا کو سخت کوفت ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب کو خاص طور پر دو مرتبہ توجہ دلائی ۔ مولانا کی دونوں مرتبہ کی تحریریں جو اُن کے خطوط بنام مولوی عبدالحق سے لی گئی ہیں ، ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

(۱)

ان دنوں ہمارے ایک ہم وطن لالہ رگھو ناتھ سہائے نے ، جو برہم سماج لاہور کا ممبر ہے ، ایک کتاب قدیم ہندوستانی عورتوں کے حالات میں موسوم بہ ”خاتونانِ ہند“ لکھی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہندو مسلمان عورتوں کے حالات نہایت سچائی اور انصاف سے بغیر کسی قسم کے تعصب کے لکھے گئے ہیں ۔ میں بھی اس شخص کو نہایت بے تعصب جانتا تھا مگر ” خاتونانِ ہند“ میں بعض حالات دیکھنے سے میرا حسنِ ظن اس کی نسبت بالکل جاتا رہا ۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کتاب پر ، جس کی ایک کاپی عنقریب آپ کی خدمت میں پہنچے گی ، ایک منصفانہ ریویو آپ ضرور تحریر فرمائیں اور مولف کی سچائی یا تعصب یا غلط بیانی ، جو کچھ سرسری نظر میں آپ کو معلوم ہو ، بے کم و کاست پبلک پر ظاہر فرمائیں ۔ میں نے صرف دو تین مسلمان عورتوں کا اور ایک ہندو عورت کا حال اس میں پڑھا ہے ۔ ہندو عورت روپنا گڑھ کی شہزادی ہے جس کو مولف نے اورنگ زیب کی ہم عصر بتایا ہے اور نام کچھ نہیں لکھا ۔ گو میں مورخ نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی بے سر و پا اور جھوٹی تحریر میری نظر سے کبھی نہیں گزری ۔ آپ ریویو میں اس کے پترے اچھی طرح کھولیں ۔ اس کا حال صفحہ ۸۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۴ پر ختم ہوتا ہے ۔ روپنا گڑھ کا پتا بھی ضرور لگائیے گا اور اُس میں جو دریائے گومتی کا واقع ہونا ظاہر کیا ہے ، اس پر بھی غور فرمائیے گا ۔ جب یہ مضمون چھپ جائے تو ایک کاپی لالہ رگھو ناتھ سہائے کے پاس ضرور بھجوائیے گا ۔

(۲)

آج میں نے حسبِ قرار دادِ سابق ”خاتونان ہند“ کی ایک کاپی رجسٹری کرا کر آپ کے نام رَوانہ کی ہے ۔ اس پر ریویو لکھنے کے متعلق میں اپنے پہلے خط میں لکھ چکا ہوں ۔ ریویو لکھوانے سے مقصود یہ ہے کہ مولف ، جو میرا ہم وطن ہے ، اس کو شرمایا جائے کہ باوجود برہمو ہونے اور دعویٰ بے تعصبی کے ایک ایسی کتاب میں ، جو عورتوں کے لیے لکھی گئی ہو اور جس کا مقصد ہندوستان کی عورتوں کے خیالات کی اصلاح ہو ، ایسے متعصبانہ خیالات ظاہر کرنے اور وہ بھی محض بے اصل اور تاریخ کے خلاف ایک برہم سماج کے ممبر سے نہایت بعید اور قابل افسوس ہے ۔ میں

نے اس کتاب کو محض سرسری نظر سے دیکھا ہے ۔ پدمنی کا حال اور علاءالدین غوری کا اس کے معاملے میں شانِ حکومت اور سلطنت کے خلاف کارروائی کرنا یہ تو ایک تاریخی واقعہ قرار پا گیا ہے ۔ لیکن اسی کتاب میں ایک اور ہندو عورت کا حال چند صفحوں پر لکھا ہے ، جس کو عالمگیر کا ہم عصر قرار دیا ہے ۔ اگرچہ تاریخ پر میری نظر نہایت محدود ہے لیکن اس عورت کے حالات روایت اور درایت دونوں کے خلاف مجھ کو معلوم ہوتے ہیں ۔ عورت کا نام تک نہیں لکھا ۔ دریاے گومتی کو ایسے ملک میں نشان دیا ہے جس سے جغرافیائی قیاس بالکل ابا کرتا ہے ۔ عالمگیر پر ایسے اتہام لگائے ہیں جن کو عالمگیر کا کوئی دشمن مورخ بھی میرے نزدیک تسلیم نہ کرے گا ۔ چوں کہ آپ نے عالمگیر کی لائف کو ایک مصنف کی نظر سے مطالعہ کیا ہے ، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ بہت آسانی سے مؤلفِ مذکور کی قلعی کھول سکیں گے ۔ مگر ریویو کی طرز بیان بہت شائستہ اور الفاظ نہایت سنجیدہ ہونے چاہئیں ، جن سے برہم سماج کے تمام ممبر متاثر اور شرمندہ ہوں ۔ یہ سماج برخلاف آریہ سماج کے نہایت آزاد اور صلح پسند ہے ، اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ کے ریویو کا ان لوگوں پر عمدہ اثر ہوگا ۔ ریویو میں اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیے کہ جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں ، وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، برہمو ہوں یا آریا ۔

والسلام

خاکسار ۔ الطاف حسین حالی
پانی پت ۔ ۸ اکتوبر ۱۹۰۸ع

۳۱

سوانح عمری حضرت محمدؐ

(منقول از سوانح عمری مذکور ، ایڈیشن دوم ، مطبوعہ ۱۹۰۸ع صفحہ ۱۳۵)

یہ کتاب شردھے پرکاش دیوجی نے ، جو برامھ دھرم کے پرچارک تھے ، اول مرتبہ اپریل ۱۹۰۷ع میں شائع کی تھی ۔ یہ ۱۳٦ صفحات کی چھوٹی تقطیع کی کتاب ہے ، جس میں لائق مصنف نے تمام واقعات نہایت اختصار ، بہت بے تعصبی اور بے حد دل نشیں اور دل چسپ پیرایے میں بیان کیے ہیں ۔ اعتراضات کے نہایت خوش اسلوبی ، عمدگی اور متانت کے ساتھ معقول جوابات دیے ہیں ۔ وہ لوگ جو جا و بے جا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے رہتے ہیں ، اس کتاب کو ضرور مطالعہ کریں ۔ کتاب کے عمدہ اور بے تعصب ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب کتاب شائع ہوئی تو مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور تمام مسلم پریس نے اس کی بے انتہا تعریف کی اور اسے بے تعصبی اور روشن خیال کا بہترین نمونہ قرار دیا ۔ یہ ریویو مولانا نے مصنفِ کتاب کی درخواست پر لکھ کر انھیں بھیجا تھا ، جو انھوں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں شائع کر دیا تھا اور وہیں سے یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

اس کتاب کی نسبت جو کچھ میں نے اخباروں میں دیکھا اور لوگوں سے زبانی سنا تھا ، اُس سے بہت زیادہ اس کو تعریف کے لائق پایا ۔ معزز مصنف نے یہ کتاب لکھ کر سچائی اور حق پسندی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے ، جس کی ہم سب ہندوستانیوں کو تقلید کرنی چاہیے ۔ اب تک ہمارے تمام ہم وطن ، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ، اس خیال خام میں مبتلا رہے ہیں کہ غیر مذہب کی خوبیوں پر جہاں تک ممکن ہو پردہ ڈالیں اور چن چن کر اُس کی برائیاں ظاہر کریں ۔ جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے ، تمام اہل مذاہب اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ غیر مذہب کے کسی اعتراض کو تسلیم کر لینا یا اُس کی کسی خوبی کا اقرار کرنا اپنے مذہب سے نکل جانے کے برابر ہے ۔ براھم دھرم کا یہ اصول کہ وہ ہر ایک مذہب کے پیشواؤں کی تعظیم کرتا ہے ، بالکل اصولِ اسلام کے مطابق ہے اور یہی وہ اصول ہے جس سے امید ہے کہ مذہبی جھگڑے شاید رفتہ رفتہ دنیا سے مفقود ہو جائیں ۔

اگرچہ مجھے یقین ہے کہ شردھے پرکاش دیوجی نے یہ کتاب مسلمانوں کے خوش کرنے کے لیے نہیں ، بلکہ محض صداقت کے ظاہر کرنے کے لیے لکھی ہے ، لیکن چوں کہ مسلمانوں کا خوش ہونا اُس کا لازمی نتیجہ ہے ، اس لیے وہ تمام مسلمانوں کی طرف سے دلی شکریے کے مستحق ہیں ۔

۳۲

دستۂ گل

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۴۲)

دستۂ گل مولانا شبلی کی فارسی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ۔ جب مولانا شبلی نے مولانا حالی کے پاس یہ گلدستہ ہدیۃً بھیجا تو وہ اُسے دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے اور اس کے متعلق اپنی جو رائے مولانا شبلی کو لکھ کر بھیجی ، وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

دستۂ گل پہنچا ، میں نے اس مجموعے کا نام تو احسن اللہ خاں ثاقب سے ، جو ابھی میرے ہاں مہمان رہ کر گئے ہیں ، سنا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ لائبریری پانی پت میں میں نے اسے منگوانے کو بھی لائبریرین سے کہہ دیا تھا ، مگر اب تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا ۔ اب جو آپ نے عنایت فرمایا تو اول سے آخر تک اس کو دیکھا ۔ کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان ، الفاروق اور سوانح عمری مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں ۔ غزلیں کاہے کو ہیں ، شرابِ دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے ۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو ، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اُس سے بھی بہت زیادہ گرم ہیں :

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے ! مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا ۔ ''الا الذی ابتلٰی بمثل ما ابتلٰی بہ القائل ۔''

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلامِ نظم و نثر جو کچھ ہے ، اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں ۔ و لیس فی ذالک شائبۃ من التصنع ۔

۳۳

تصانیف نواب عزیز جنگ بہادر

(منقول از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۴ اگست ۱۹۰۹ع)

اپنے اس تبصرے میں حضرت مولانا حالی مرحوم نے نواب عزیز جنگ بہادر کی بہت ہی کم کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم بہت سی اعلٰی پایے کی کتابوں کے مصنف اور مولف تھے ۔ اور تصنیف و تالیف کی وسعت ، جامعیت اور کثرت کے لحاظ سے حیدر آباد دکن کا شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو ، جو ان کا مقابلہ کر سکتا ہو ۔ اُن کے مفصل حالات زندگی اور اُن کی کتابوں کی مکمل فہرست کتاب ''دکن میں اُردو'' میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

(محمد اسماعیل)

جن لوگوں نے زمانۂ حال میں اپنے گراں بہا تصنیفات سے اُردو زبان کو سرمایہ دار بنایا ہے اور اپنی لٹریری قابلیت سے جس قدر خود فائدہ اُٹھایا ہے ، اُس سے بہت زیادہ پبلک کو فائدہ پہنچایا ہے ، اُن میں نواب عزیز جنگ بہادر کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے ۔

وہ عرصۂ دراز تک سرکار عالی نظام (خلد اللہ ملکہ) میں عمدہ خدمات پر سرفراز رہے ہیں اور اب بہ جلدوئ حسنِ خدمت مختلف صیغوں سے معقول وظیفہ پاتے ہیں ۔ زمانۂ ملازمت میں اُن کی تصنیف و تالیف کا میدان زیادہ تر فنِ قانون تک محدود رہا ۔ چناں چہ

اس عرصے میں تیرہ کتابیں آپ نے بہ حسبِ ضرورت مختلف اوقات میں ترتیب دیں ، جن کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ سرکار عالی سے مرحمت ہوا ۔ یہ کتابیں صدر اور مفصلات کے تمام دفاتر میں عام مقبولیت کا درجہ رکھتی ہیں اور تمام مالی اور حسابی دفتروں میں آج تک انھیں سے کام چلتا ہے ۔

ان قانونی تالیفات کے بعد آپ نے ایک لاجواب کتاب موسوم بہ ''سیاق دکن''[١] ۱۳۱۳ فصلی میں شائع کی جس میں عالی قدر مصنف نے فنِ سیاق کی حقیقت مورخانہ طور سے بیان کی ہے ۔ اگرچہ اس کتاب کا نام ''سیاق دکن'' ہے لیکن در حقیقت خلافت کے زمانے سے آج تک تمام اسلامی سلطنتوں کے دفاتر میں جو طریقہ حساب کتاب کا جاری رہا ہے ، یہ کتاب اس پر ''کلیۃً'' حاوی ہے ۔ ہم اس کتاب کی تعریف میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے ریویو کا صرف ایک فقرہ لکھنا کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے کتاب مذکور کی نسبت تحریر فرمایا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''ہم نے تاریخ کے سیکڑوں ہزاروں ورق الٹے ہیں اور مدت تک جستجو کی ہے کہ قدیم زمانے کے ہر قسم کے طریقۂ کارروائی سے واقف ہوں ۔ اور گو ہم نے چند معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کر لیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ جو کچھ ڈھونڈ کر پا سکے وہ من میں چھٹانک بھی نہ تھا ۔ نواب عزیز جنگ بہادر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۶۶ صفحے کی کتاب تیار کر دی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے ۔''

---

[١] اس کتاب پر ۱۹۰۴ء میں بھی مولانا مختصر ریویو کر چکے ہیں ۔
(محمد اسماعیل)

اب کتاب کے دیکھنے سے سلاطین تیموریہ کے زمانے کا طریقہ سیاق اس طرح آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے کہ گویا ہر قسم کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ یہ نادرالوجود کتاب سرکار نظام کے سر رشتۂ تعلیم کے کورس میں داخل ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس کی قدر ہوئی ہے ۔

مصنفِ ممدوح جہاں تک دیکھا جاتا ہے ، معمولی اور پامال مضامین پر ہاتھ نہیں ڈالتے ، بلکہ ہمیشہ اچھوتے مضامین پر ، جن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ، قلم اٹھاتے ہیں ۔

انھوں نے کاشت خرما ، کاشت انگور ، کاشت انجیر اور کاشت ترکاری پر بہت بسط کے ساتھ مفید کتابیں لکھی ہیں ، جن میں سے اول کی دونوں پر سرکار عالی سے معقول انعام عطا ہوا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ایگریکلچر آفس نے ان پر نہایت تعریف کے ساتھ ریویو لکھا ہے ۔ ایک اور کتاب فنِ فلاحت ہی کے متعلق موسوم بہ ''علاج النباتات'' زیر تصنیف ہے جس میں نباتات کی بیماریوں اور ان کے معالجات کا بیان ہے اور جو عنقریب چھپنے والی ہے ۔

۱۳۲۲ ھجری میں مصنف ممدوح نے ایک اور مبسوط کتاب تقریباً پونے چھ سو صفحے کی فن تاریخ میں شائع کی تھی ، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہے اور جس کا نام ''تاریخ النوایط'' ہے ۔

تاریخ دکن میں مدت سے یہ سوال حل طلب چلا آتا تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعتِ کثیر ، جو مدت دراز سے سواحلِ بحر ہند یا جنوب مغربی ہند میں نائط یا نائطی کے نام سے نام زد ہے اور جس میں بڑے بڑے اہل اللہ ، والیان ملک ، وزراء ، امراء ، علماء ، شعراء اور تجار ہوتے رہے ہیں ، اس کی اصل کیا ہے ۔ آیا یہ کوئی قوم حدیث الاسلام ہے یا کسی عہد میں سر زمین عرب سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے ؟ اگرچہ قوم نایط کا اجمالی ذکر لغت اور تاریخ کی اکثر

کتابوں میں کیا گیا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس عقدے کے حل کرنے میں بہت سی ایسی مشکلات تھیں اور مصنفین کے بیانات میں اس قدر اختلافات تھے کہ اجمالی ذکر سے اس مرحلے کا طے ہونا امکان سے خارج تھا ۔

مصنفِ ممدوح نے کم و بیش چھ سو صفحے کی کتاب اس ایک تاریخی سوال کے حل پر لکھی ہے اور حق بات کا سراغ لگانے میں ایسی چھان بین کی ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آ سکتی ۔ ہمارے نزدیک اگر جلیل القدر مصنف خود قوم نایط کے ایک مقتدر رکن نہ ہوتے تو اُن تمام اُلجھنوں کا سلجھانا جو اس سوال کے حل کرنے میں پیش آنے والی تھیں ، ایک ایسا کام تھا جس سے شاید وہ عہدہ برآ نہ ہو سکتے ، جیسا کہ کہا گیا ہے اهل البیت ادری بما فیہ ۔

سب سے بڑی مشکل اس سوال کے حل کرنے میں یہ تھی کہ قوم نوایط کے مخصوصات رسم و رواج اور القاب وغیرہ میں بہت سی باتیں ایسی موجود تھیں اور ہیں جو ہندوؤں کے بعض اقوام سے ملتی جلتی ہیں اور جن سے قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقوام ہنود میں سے کوئی قوم ہے ۔ مگر معزز مصنف نے متعدد تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ قوم نوایط عرب کے اُن مہاجرین کی یادگار ہیں جنھوں نے زیادہ تر بنی اُمیہ کے عہد میں اور کسی قدر بنی عباس کے زمانے میں حکومت کی سختیوں سے تنگ آ کر عرب سے ہجرت اختیار کی اور آخرکار آٹھویں صدی[1] ہجری میں دریا کی راہ سے سواحل بحر ہند میں پہنچ کر بھٹکلہ ، کوکن ، گووہ وغیرہ میں سکونت اختیار کی ۔ اور محمد ہاشم خاں نظام الملکی کی کتاب ”منتخب اللباب“ نے کافی ثبوت اس بات کا دیا ہے کہ اس قوم کے لوگ جب اول ہی اول ہندوستان میں پہنچے تو ایک عرصۂ دراز تک ان کو ہندوؤں کی حکومت میں رہنا اور اُن تمام شرائط کو منظور کرنا پڑا جو فرماں روایان وقت کی طرف سے پیش ہوئیں اور جن کی منظوری بغیر وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی ۔ ان شرائط کے موافق ان کو مذہبی عقائد کے سوا تمام امور میں ہندوانی طرز معاشرت اختیار کرنی ضرور تھی ۔ چناں چہ جب تک وہاں کی حکومت میں انقلاب پیدا نہیں ہوا ، وہ تمام ہندوانی رسم و رواج کے پابند رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بھی اُس قدیم طرز معاشرت کے آثار بہت کچھ قوم نایط کے اکثر گھرانوں میں پائے جاتے ہیں ۔

مصنف نے اس کتاب میں قوم نایط کے تمام مخصوصات یعنی مذہب ، لباس ، زبان ، طریقۂ تعلیم و تربیت ، کفو کی پابندی ، پردے کا رواج اور دیگر رسوم اور قومی انقلاب ، جن سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے متمیز ہوتا ہے ، ایسی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ تمام قوم کی طرز معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ مثلاً تعلیم نسواں کے بیان میں علاوہ سینے پرونے اور دیگر دستکاریوں کے اٹھائیس طرح کی مٹھائیاں اور پکوان بتائے ہیں ، جو قوم نایط کی لڑکیوں بلکہ لڑکوں کو بھی سکھائے جاتے ہیں ۔ یا مثلاً ساٹھ زیوروں کے نام اور اُن کی تعریف بیان کی ہے ، جو اس قوم کی مستورات استعمال کرتی ہیں ۔ خصوصاً قوم نایط کے مختلف قبائل کے تقریباً ستر القاب اور اُن کی وجہ تسمیہ نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ بیان کی ہے ۔ اس کے بعد ایک مستقل باب میں قومِ موصوف کے مشاہیر کا حال ، جن میں سر سالار جنگ اول ، حیدر علی نایک اور ٹیپو سلطان جیسے ممتاز امرا اور بڑے بڑے علما اور شعرا اور اہل اللہ اور نامور تجار شامل ہیں ، شرح اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

---

[1] غالباً اس میں غلطی ہے اس لیے کہ عباسی خاندان کا خاتمہ ۶۵۶ھ میں ہو گیا تھا ۔

یہ کتاب مصنف کی اُس خاص صفت پر، جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، بدرجۂ اوفیٰ دلالت کرتی ہے۔ یعنی ہر ایک کام کو پوری طاقت کے ساتھ انجام دینا اور تصنیف کے فرائض ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا۔ اس کتاب کو قطع نظر ممالک دکن کے، جہاں قوم نایط کثرت سے پائی جاتی ہے، اور اطرافِ ملک میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ چناں چہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے اور اس کی معتدبہ جلدیں خریدی ہیں۔

فن تاریخ میں مصنف ممدوح نے ایک اور کتاب موسوم بہ ''محبوب السیر'' حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کی بست سالہ حکومت پر لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی ہندوستان میں بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہے۔

حال میں اُنھوں نے ایک اور نفیس کتاب جس کا نام ''عطیات سلطانی'' ہے، چھپوا کر شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھی مصنف کی اکثر تصنیفات کی طرح بالکل ایک نرالی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام سننے سے فوراً یہ خیال ذہن میں متبادر ہوتا ہے کہ شاید حضور شاہ دکن نے کسی خاص موقع پر کچھ عطیات لوگوں کو مرحمت فرمائے ہیں، اُن کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہوگی۔ مگر جب کتاب کو کھول کر دیکھا جاتا ہے تو ایک عجیب ذخیرہ معلومات کا نظر آتا ہے۔ جس کی نسبت جناب مولوی ابو المظفر محمد سعید الدین صاحب رام پوری نے اپنے ریویو میں بالکل درست اور بجا لکھا ہے کہ:

> ''فن تاریخ میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری نظر سے گزری ہے۔ ہم بے شک واقف تھے کہ بادشاہان سلف نے اہل ملک کو قیمتی معاشیں اُن کی گزر اوقات کے لیے عطا فرمائی ہیں اور اُن کے صدقۂ جاریہ سے صفحہ روزگار پر اُن کی اعلیٰ یادگار قائم ہے۔ اور بعض صاحبان تاریخ نے کہیں کہیں اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن ہم یہ نہ جانتے تھے کہ اس کی کیفیت اس قدر مبسوط اور دلچسپ ہے کہ اُس سے فن تاریخ کا ایک مکمل ذخیرہ ہاتھ آ سکتا ہے۔''

ہم اُوپر لکھ چکے ہیں کہ مصنف ممدوح اُن معمولی مضامین پر بہت کم قلم اُٹھاتے ہیں جن پر اُن کے پہلے لوگ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی قبیل کی ایک تصنیف ہے۔ ممالک دکن میں معاش داروں کا ایک جم غفیر ہے، جس کو شاہانِ سلف سے وقتاً فوقتاً کثیر المقدار اور کثیر التعداد انعامات و جاگیرات وغیرہ بطور مددِ معاش کے عطا ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے انھیں انعامات و جاگیرات کو ایک خاص ترتیب اور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصلی حقیقت اور مصنف کی عرق ریزی اور تحقیقات کا حال تو بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک بغور مطالعہ کیا جائے، معلوم نہیں ہو سکتا، مگر اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے بالاجمال بیان کر دینے سے کتاب کی عظمت بخوبی منکشف ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے ورق ورق اور صفحے صفحے سے ریاست حیدر آباد کی عام فیاضی، بے تعصبی اور انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جو شاید دنیا کی کسی حکومت یا سلطنت میں نہیں مل سکتا۔ ہندو، مسلمانوں کے معابد اور اُن کی مذہبی رسوم میں جو امداد اس ریاست سے ہوتی ہے، اُس کے متعلق معزز مصنف کا بیان ہے کہ:

> ''ان اقسامِ عطیات سے جو خاص کر اس باب میں بیان ہوئی ہیں، ہم نے مسلمانوں کی معاش کی تعداد اور مقدار بہ نسبت معاش ہائے ہنود کے بہت کم پائی ہیں۔

ختم خوانی ، اعتکاف اور چلہ کشی کی معاشیں (جو خاص مسلمانوں سے علاقہ رکھتی ہیں) صرف خال خال ہیں ۔ بر خلاف اس کے اگنی ہوتر ، نند ادیب اور اساڑھی کی معاشیں (جو ہنود سے متعلق ہیں) کثرت سے جاری ہیں ۔‘‘

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ :

’’ہمارا حتمی دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی کل دیسی ریاستوں میں سے ایک ریاست بھی سلطنتِ آصفیہ کے ساتھ اس خاص صفتِ بے تعصبی میں ہم قدم نہ ہو سکے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رحم دل رئیس پر ، جس طرح اس کی مسلمان رعایا فدا ہے ، اسی طرح اس کی ہندو رعایا جاں نثار ہے ۔ یہ صفت اس خاندان میں سلف سے چلی آتی ہے اور یہ پرداخت صرف لفظوں ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی مادی شہادت سر رشتۂ عطیات کی سیر کرنے سے حاصل ہوتی ہے ۔ ہمارا مالک جس طرح اسلامی تقاریب میں نذریں اور پیش کشیں قبول کرکے مسلمانوں کو عزت بخشتا ہے ، اسی طرح اپنی ہندو رعایا کی مذہبی تقاریب میں اُن کی نذریں اور تحفے قبول فرماتا ہے ۔ اگر کسی نووارد سجادہ نشینِ درگاہ کی مہمانی میں کوتاہی نہیں ہوتی تو ساتھ ہی کسی سیاح مہاتما اور مہاپُرش کی خدمت اور امداد سے بھی کنارہ کشی نہیں کی جاتی ۔ حیدر آباد کے چار صوبوں میں ایک کا گورنر مسلمان تو دوسرے کا گورنر ہندو ہے اور باقی دو کے گورنر بھی غیر مسلمان ہیں ۔ معتمدِ مال کرسچین ہے تو معتمدِ عدالت مسلمان اور معتمدِ پولٹیکل پارسی ۔ تعلقہ دارانِ اضلاع میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش ہیں ۔ ہائی کورٹ کے نظا

> میں ہندو اور مسلمانوں کا جوڑا لگا ہوا ہے ۔ نظماے صوبہ کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ ججان و مددگارانِ عدالت اور مجسٹریٹوں میں بھی یہی نسبت ہے ۔ دو معین المہام مسلمان ہیں تو ایک کرسچین اور ان پر وزیر اعظم ہندو ۔ یہی وجہ ہے کہ جو اتحاد و یک جہتی ریاست ممدوح کے ہندو مسلمانوں میں پائی جاتی ہے ، وہ کسی ہندوستانی ریاست میں دیکھی یا سنی نہیں گئی ۔ اسلامی پیشواؤں کی نذر و نیاز کی تقریبیں اور عشرۂ محرم الحرام میں عزاداری کے مراسم ہنود کے گھروں میں اسی طرح جاری ہیں ، جیسے مسلمانوں کے گھروں میں ۔

علی ھذا القیاس جاتراؤں میں مسلمانانِ ریاست برابر ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں ۔ جوبلی چھل سالہ کے موقع پر ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ خوشی اور شادمانی کے اظہار میں ہر ایک مذہب و ملت کی جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت کرنی چاہتی تھیں ۔ اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہر ایک قوم کے مردوں کی طرف سے پیش گاہ حضور نظام میں بے شمار سپاس نامے اور ایڈریس پیش ہوئے تھے ، اسی طرح عیسائی اور پارسی عورتوں نے بھی اس خوشی میں حصہ لیا تھا ۔

اگرچہ یہ کتاب ایک مختص المقام مضمون (یعنی ریاست حیدر آباد کے اقسام عطیات) پر مشتمل ہے ، لیکن در حقیقت وہ عام ہندوستانیوں کے لیے بھی ، جو مورخانہ مذاق رکھتے ہیں ، ویسی ہی دلچسپ اور پُر لطف ہے ، جیسی اہل دکن کے لیے ۔

میں خیال کرتا ہوں کہ سررشتۂ تحقیقاتِ عطیات جو حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کے عہدِ میمنت میں قائم ہوا ہے ، اگر معزز مصنف کو ایک معتدبہ مدت تک اُس سے خاص تعلق نہ

رہا ہوتا اور اُن کی ہمہ گیر طبیعت میں ہر قسم کی معلومات سے فائدہ اٹھانے اور عمدہ نتائج پیدا کرنے کا مادہ نہ ہوتا ، تو وہ اس مضمون پر ایسی دلچسپ اور پُر لطف کتاب لکھنے میں مشکل سے کامیاب ہو سکتے تھے ۔

نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیفات کا سلسلہ مذکورہ بالا کتابوں ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے ، انھوں نے ابھی ایک اور نادر کتاب موسوم بہ ''غرائب الجمل'' ۴۱۸ صفحے پر چھاپ کر شائع کی ہے جو فنِ جمل میں (جس کی رو سے واقعات کی یادداشت کے لیے تاریخی مادے استخراج کیے ہیں) جہاں تک کہ راقم کو معلوم ہے ، ایک بے مثل و لاجواب تالیف ہے ۔

اس کے سوا کئی سال سے آپ نے ایک فارسی ڈکشنری بھی لکھنی شروع کر رکھی ہے جس میں علاوہ فارسی الفاظ و محاورات کے ہر فارسی لفظ یا محاورے کی تحقیق کے بعد جو محاورہ اس کی جگہ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے ، اسے بھی ساتھ کے ساتھ بیان کیا ہے اور دونوں زبانوں کا کوئی لفظ یا محاورہ (الا ماشاء اللہ) ایسا نہیں لکھا جس پر اہل زبان کے کلام سے ایک سند یا متعدد سندیں پیش نہ کی گئی ہوں ۔ ظاہر ہے کہ معزز مصنف نے یہ ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کا پورا ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ حیدر آباد میں انھوں نے اس کتاب کا اندازہ فرما کر راقم سے کہا تھا کہ اگر وہ ختم ہو گئی تو ۲۸ جلدوں میں آئے گی اور ہر ایک جلد سات آٹھ سو صفحات سے کم نہ ہوگی ۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ کتاب میری زندگی میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی ۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے ان کی ذات میں وہ تمام صفات جمع کر دی ہیں جو بڑے بڑے مصنفین میں سنی اور دیکھی گئی ہیں ۔ ہمت ، جفا کشی ، ضبط اوقات ، حسن انتظام ، فضول کاموں سے نفرت ، سلیقہ ، ستھرائی اور اسی قسم کے دیگر اوصاف ، جو ان میں دیکھے گئے ہیں ، وہ بہت ہی کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں ۔

ہم کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اُن کی عمر میں ، اُن کے اوقات اور اُن کے مساعیِ جمیلہ میں برکت دے گا اور اُن کو اپنے اس ارادے میں کامیاب فرمائے گا ۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

۳۲

فلسفۂ ازدواج

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۱۰۰)

یہ کتاب مولوی سید اصغر علی بلگرامی کی تصنیف تھی ۔ اور $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ کی تقطیع پر شائع ہوئی تھی ۔ قریباً ڈیڑھ سو صفحات ہوں گے ۔ جب آنھوں نے یہ کتاب لکھی تو مولانا کو ریویو کے لیے بھیجی ۔ مولانا کی صحت نے اس وقت جواب دے دیا تھا اور وہ لکھنے پڑھنے سے بہت حد تک معذور ہو گئے تھے ۔ تاہم آنھوں نے مولوی سید علی اصغر کو مایوس نہیں کیا اور بہ طور تعارف چند سطریں اپنے خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۹ع میں لکھ کر آنھیں بھیج دیں ۔ جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

عنایت نامہ ظری پرچۂ هذا پہنچا ۔ افسوس ہے کہ میری صحت اور طاقت نے جواب دے دیا ہے ۔ مختلف عوارض میں مبتلا ہوں ۔ لکھنا پڑھنا گویا بالکل موقوف ہو گیا ہے ۔ با ایں ہمہ آپ کی مفید اور مناسبِ وقت تصنیف ''فلسفۂ ازدواج'' کو اکثر مقامات سے دیکھا ۔ اگر میں کچھ لکھ سکتا تو یہ کتاب ضرور اس قابل تھی کہ اس پر مفصل ریویو لکھا جاتا ، مگر سر دست اس قدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر ملک اور قوم پر

بڑا احسان کیا ہے ۔ میرے نزدیک ہر متأہل اور غیر متأہل شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے ، اس کی ہدایتوں پر عمل کرے اور جس ہدایت پر خود عمل نہ کر سکتا ہو ، اس پر اپنے متأہل دوستوں اور عزیزوں کو اور ان نوجوانوں کو ، جو عنقریب اس جوئے کو اپنی گردن پر رکھنے والے ہیں ، ان پر عمل کرنے کی تاکید کرے کیوں کہ یہ ہدایتیں ماؤں اور بچوں کی صحت اور بقائے نسل کے لیے ایسی ضروری ہیں کہ ان سے کسی طرح مفر نہیں ۔ اُمید ہے کہ آپ کی یہ کتاب ملک میں نہایت مقبول ہوگی ۔

خاکسار ۔ الطاف حسین حالی

۳۵

معرکۂ مذہب و سائنس

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۶۳)

یہ کتاب ڈریپر کی تصنیف کا نہایت سلیس اور رواں ترجمہ ہے ، جو مولوی ظفر علی خاں بی۔ اے ایڈیٹر 'زمیندار' نے کیا تھا اور مولانا حالی کو ہدیے کے طور پر بھیجا تھا ۔ حضرت مولانا نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ، وہ نیچے درج کیا جاتا ہے ۔ یہ مضمون مولانا کے خط بنام ظفر علی خاں مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۱۰ع سے لیا گیا ہے ۔ (اسماعیل)

معرکۂ مذہب و سائنس کی نسبت بہ لحاظ ترجمے کی خوبی کے جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے ، اُس کو میں مبالغے سے بالکل پاک سمجھتا ہوں اور ترجمے کے لیے اس کتاب کے انتخاب کرنے کو میں آپ کی اعلیٰ درجے کی قوتِ ممیزہ کی ایک روشن علامت سمجھتا ہوں ۔ اس باب میں جو خط میں نے پہلے لکھا تھا ، اُس کا جواب آنے پر جس طرح ہو سکا ، میں نے جستہ جستہ اس بے مثل کتاب کے اکثر حصے دیکھے ۔ اور اگر زندگی نے وفا کی تو جب موقع ملے گا ، اُس کو بار بار دیکھوں گا ۔

۳۶

خطوط امیر احمد مینائی

(منقول از خطوط امیر احمد مینائی ، صفحہ ۱ - ۳)

منشی امیر احمد مینائی لکھنؤ کے رہنے والے مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے فرزند ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ع) میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ع) میں انتقال کیا ۔ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب تھے ۔ یہ کتاب منشی صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اُنھوں نے اپنے شاگردوں ، عزیزوں ، رشتہداروں اور دوستوں کو لکھے ۔ یہ خطوط منشی صاحب کے شاگرد رشید مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب نے عرصۂ دراز کی تلاش کے بعد جمع کرکے نومبر ۱۹۱۰ع میں شائع کیے تھے ۔ آج کل نایاب ہیں ۔ مولانا حالی کی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا ، مگر لائبریری کے ساتھ ہی وہ بھی برباد ہو گیا ۔ (محمد اسماعیل)

کتابِ مندرجہ عنوان کا مسودہ ، جو میرے لائق دوست خواجہ محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر رسالہ مرحوم "قند پارسی" نے مرتب کیا ہے ، میری نظر سے گزرا ۔ خواجہ صاحب موصوف جناب منشی امیر احمد صاحب مغفور سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں ۔ اُن کا شاگردانہ خلوص اس بات کا مقتضی تھا کہ اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی کسی مناسب پیرائے میں ادا کریں ۔ اول

انھوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا مگر بعض اسباب سے ، جن کا ذکر انھوں نے دیباچے میں کیا ہے ، میٹیریل بہت کم میسر آیا ۔ پھر ان کے مکتوبات جمع کرنے کی طرف توجہ کی ، لیکن باوجود اس کے کہ ایک عالم سے جناب ممدوح کی خط و کتابت تھی ، خطوط بھی بقدر توقع بہم نہ پہنچے ۔ بہ ایں ہمہ ایک معتدبہ مقدار مکاتیب کی جمع ہو گئی ۔

اگرچہ ایک ایسے نامور بزرگ کے حالات لکھنے کے لیے یہ مختصر ذخیرہ کافی نہ تھا ، لیکن اس خیال سے کہ شاید آیندہ کوئی صاحب اس عمارت کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور یہ تالیف اس عمارت کے لیے ایک بنیاد کا کام دے سکے ، خواجہ صاحب موصوف نے میٹیریل کی کمی سے ہمت نہیں ہاری اور اپنی خوش سلیقگی سے اس مختصر ذخیرے کو ترتیب دے کر ایک دلکش پیرایے میں ظاہر کیا ہے ۔

اُنھوں نے اس کتاب میں اول جناب ممدوح کی مختصر لائف قلم بند کی ہے ، پھر اُن کے کلام پر نہایت آزادی کے ساتھ ریویو کیا ہے اور اُن کے دونوں دیوانوں کا مقابلہ فصیح الملک مرحوم کے دیوانوں سے کر کے دونوں اُستادوں کے کلام میں جو فرق دیکھا وہ بغیر کسی قسم کے حیف و میل کے پبلک پر ظاہر کیا ہے ۔ اور پست و بلند دونوں قسم کے اشعار کے نمونے دونوں صاحبوں کے کلام سے التقاط کر کے ناظرین کو دکھائے ہیں ۔

اگرچہ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اہل قلم میں ابھی تک نکتہ چینی کا تحمل اور اُس کی برداشت پیدا نہیں ہوئی ، لیکن اگر ان کو رفتہ رفتہ اس کا عادی نہ کیا جائے تو امید نہیں کہ ہماری تصنیف و تالیف کے عیوب و صواب کبھی پبلک پر ظاہر ہو سکیں ۔

اس کے بعد انھوں نے اس مقصد کی طرف توجہ کی ہے جس پر کتاب کا نام مندرجۂ عنوان دلالت کرتا ہے ، یعنی جناب منشی صاحب مرحوم کے خطوط جس قدر بہم پہنچے ، ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے ۔

انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف ، جیسا اس کی بے تکلفانہ خط و کتابت سے ہو سکتا ہے ، ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا ۔ اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے ۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجودِ عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا ، اور اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا ، اب اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس ۔ پس کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا در حقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے ۔ مجھے اُمید ہے کہ مکتوبات امیر کی اشاعت خاص کر اُن لوگوں کے لیے جو حضرت امیر احمد مینائی سے عقیدت رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ہندوستان میں کچھ کم نہیں ہے ، ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی ۔

٣٧

حکمت عملی

(رسالۂ مخزن لاہور ، جلد ۲۰ ، نمبر ۳ ، بابت ماہ
دسمبر ۱۹۱۰ع ، صفحہ ۵۰ و ۵۱)

پروفیسر مرزا سجاد بیگ دہلوی نے علم الاخلاق پر ایک اعلیٰ پایے کی مبسوط کتاب ۱۹۱۰ع میں بڑی تقطیع کے ۴۵۰ صفحات پر حیدر آباد دکن سے شائع کی تھی ۔ قیمت تین روپے تھی ۔ یہ اُسی کا ریویو ہے جو مولانا حالی نے لکھ کر رسالۂ مخزن میں شائع کرایا تھا ۔
(محمد اسماعیل)

یہ مفید اور قابلِ قدر کتاب میرے عزیز اور لائق دوست مولوی محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی نے علمِ اخلاق پر لکھ کر کچھ عرصہ ہوا شائع کی ہے ۔ لائق مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے اردو زبان کی ایک ایسی ضرورت پوری کی ہے ، جو بہت مدت سے ملک میں محسوس ہو رہی تھی ۔ اگرچہ گزشتہ تیس برس کے زمانے میں بہت سے رسالے اور کتابیں اس فن میں لکھی اور شائع کی گئی ہیں ، لیکن جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ان میں سے ایک بھی ہماری ضرورت رفع کرنے والی نہ تھی ۔ ہم کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اس فن میں جو کتاب لکھی جائے ، اس کی زبان فصیح اور نہایت صاف ہو ۔ جو مطالبِ علمیہ اس میں بیان کیے جائیں ، وہ علمِ اخلاق کی مقررہ اصطلاحات کے دائرے سے خارج نہ ہوں اور کتاب

فلسفۂ قدیم و جدید دونوں کے ضروری مسائل پر مشتمل ہو ۔ جہاں تک میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے ، یہ سب خصوصیتیں اس میں بوجہِ احسن پائی جاتی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے زبان اور بیان کی صفائی ، اصطلاحاتِ علمی کی تلاش اور فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعے اور اُن میں مہماتِ مسائل کے انتخاب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگزاشت نہیں کیا ۔ اس کتاب میں وہ تمام مسائل بیان کیے گئے ہیں جو انسان کی ذات میں جوہرِ شرافت پیدا کرنے والے ہیں اور جن سے سعادتِ تامہ حاصل ہوتی ہے ۔

اس کتاب کے تین مقالے ہیں :

(۱) پہلے مقالے میں تہذیب اخلاق کا بیان ہے اور حکمت ، علم ، عمل کے معنی و تعریفات بیان کرنے کے بعد انسان کے حرکات طبعی و وضعی ، ملکہ و عادت عقل عملی کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے بعد قوائے انسانی ، یعنی نفس ناطقہ و قوائے غضبی و شہوانی کی حقیقت اور امراض نفسانی کی کیفیت مفصل بیان کر کے بتایا ہے کہ سعادتِ تامہ کیا چیز ہے ۔

(۲) مقالۂ دوئم میں تدبیر منزل کا بیان ہے اور اس میں منزل کے مختلف ممبروں مثلاً والدین ، اولاد ، زن و شوہر کے فرائض اور حقوق پر عالمانہ بحث کی ہے اور ایسی تدابیر بیان کی ہیں ، جو حسنِ معاشرت کے لیے اعلیٰ درجے کی سبق آموز ہیں ۔

(۳) تیسرے مقالے میں سیاستِ مدن کی تعریف ، انسان کو تمدن کی ضرورت ، سلطنت و قانون و عدالت کی حقیقت ، غلامی اور آزادی کی حالت مفصل بیان کی ہے ، اور اس کے بعد معاملاتِ رسم و رواج کا فلسفہ بیان کیا ہے ، اور ایسے مضامین درج ہیں جو قوم و ملک کی سچی محبت پیدا کرتے اور قومی عزت کے حصول کے ذرائع

بتاتے ہیں۔ اس لیے اس کا مطالعہ ہر طبقے اور ہر فرقے کے مرد و عورت پر واجب ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کا ذکر جا بجا آیا ہے اور کتاب دونوں فرقوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ یہ عمدہ تصنیف ملک میں عام قبولیت کا درجہ حاصل کرے گی اور میری دلی آرزو ہے کہ میرے ہم وطن اس سے فائدہ اٹھائیں۔

الطاف حسین حالی

۳۸

خُمخانۂ جاوید

(منقول از خُمخانۂ جاوید، جلد دوم، مطبوعہ ۱۹۱۰ع)

> اس بے نظیر کتاب کی پہلی جلد ۱۹۰۸ع میں شائع ہوئی تھی اور ابھی صرف چار جلدیں ہی چھپی تھیں کہ ۲۵ مارچ ۱۹۰۸ع کو مصنف لالہ سری رام کا انتقال ہو گیا۔ لالہ صاحب مکمل کتاب کا مسودہ مرنے سے پہلے ہندو یونیورسٹی بنارس کو دے گئے اور پنڈت برج موہن کیفی کو اس کام کا انچارج بنا گئے۔ کیفی صاحب صرف پانچویں جلد مرتب کر کے شائع کر سکے کہ یکم نومبر ۱۹۵۵ع کو وہ بھی راہیِ ملک عدم ہوئے۔ میں نے بقیہ جلدوں کے کچھ متفرق قلمی اوراق پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں دیکھے ہیں۔ یہ علامہ برج موہن کیفی کے اُس کتب خانے سے برآمد ہوئے ہیں، جو اُن کے انتقال کے بعد یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا گیا تھا۔
>
> (محمد اسماعیل)

خمخانۂ جاوید، یعنی تذکرہ شعرائے اردو زبان، مرتبہ جناب لالہ سری رام ایم۔ اے رئیس دہلی خلف الصدق جناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال مُرگباشی۔ اس تذکرے کی جو اہمیت میرے دل میں ہے اور جو خصوصیت مجھ کو صاحبِ تذکرہ اور اس کے معزز خاندان سے حاصل ہے، اس کے لحاظ سے مجھ کو اس کی پہلی

جلد پر سب سے پہلے اپنے خیالات ظاہر کرنے چاہئیں تھے ، مگر بد قسمتی سے ایسے مکروہات پیش آتے رہے کہ میں اطمینان کے ساتھ اس کی نسبت کچھ نہ لکھ سکا ۔ اگرچہ کافی اطمینان اب بھی میسر نہیں ہے ۔ لیکن چوں کہ تذکرے کی دوسری جلد بھی عنقریب چھپ کر شائع ہونے والی ہے ، اس لیے میں نے خیال کیا کہ مبادا اس اہم تالیف کی نسبت پھر مجھ کو اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے ، لہٰذا میں نے نہایت ضروری سمجھا کہ اپنی ناچیز رائے اس کے متعلق ظاہر کرنے میں اب دیر نہ کروں ۔

اس تذکرے کی پہلی جلد کو چھپے ہوئے تین برس گزر چکے ہیں ، دہلی و لکھنؤ اور اطرافِ ہندوستان کے بڑے بڑے نامور شعرا اور اہل کمال نے اس پر نہایت عمدہ رائیں ظاہر کی ہیں ۔ جس صفائی اور سلاست سے اس میں شعرا کے تراجم لکھے گئے ہیں ، اور جس سلیقے سے اُن کا کلام انتخاب کیا گیا ہے ، اور جس کوشش و جاں فشانی سے اُن کے حالات اور اُن کا کلام بہم پہنچایا گیا ہے ، اور جس ادب و احترام کے ساتھ قدما سے لے کر معاصرین تک سب کا نام لیا گیا ہے ، ان سب باتوں کو تقریباً تمام تقریظ نگاروں نے تسلیم کیا ہے ، اور سب سے بڑھ کر میں نہایت صدق دل سے تسلیم کرتا ہوں ۔ پس تذکرہ یا تذکرہ نویس کو پبلک سے روشناس کرانے کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے ۔ میں اس موقع پر صرف تذکرے کی جامعیت کی نسبت چند الفاظ لکھنے چاہتا ہوں ۔

اب تک اس تذکرے کی صرف پہلی جلد راقم کی نظر سے گزری ہے ، جو ۶۸۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے ۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس جلد میں صرف اُن شاعروں کا کلام اور اُن کے حالات درج ہوئے ہیں جن کا تخلص الف یا بے سے شروع ہوتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ منجملہ تیس کے صرف دو ردیفیں اس جلد میں قلم بند ہوئی ہیں اور کم سے کم ۲۸ ردیفیں باقی ہیں ۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر سب ردیفیں اسی شرح و بسط کے ساتھ لکھی گئیں ، جیسی کہ الف اور بے کی ردیفیں لکھی گئی ہیں تو یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اردو زبان کی ایک ایسی سائیکلو پیڈیا ہو گی ، جس کی نظیر اردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی ۔ اور اُردو زبان میں یہ ایک ایسا اضافہ ہے جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے ۔ آج کل اہل ملک کی بد قسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے ، اس کی رفع داد اگر ہو سکتی ہے ، تو اسی طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں ، جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے ، اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہر دل عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔ اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اُردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالا مال کرنے میں کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں ، جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہل دلی کی زبان تھی ۔ مذکورۂ بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے ، اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے ۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودے کہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں ، مگر اس طول طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت

کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح ، زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں ، مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا ، جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف ، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لب ریز ہے ، اس کو بھی عموماً وہ ہمیشہ بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے ۔ حالاں کہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے ۔ عربی ، فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہوگئے ہیں ۔ باقی تمام اجزائے کلام ، جن کے بغیر کسی زبان کی نظم یا نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی ، برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں ۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ ’’دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر ۔‘‘

قصہ مختصر جس ذوق و شوق سے معزز مؤلف نے اس تذکرے کے لکھنے پر کمر باندھی ہے اور جس استقلال کے ساتھ وہ طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک ان تمام مشکلات پر غالب آتے رہے ہیں جو اس مفید کام کے انجام دینے میں اُن کو پیش آئیں ، اُس سے اس عام خیال کی بوجہ احسن تردید ہوتی ہے کہ انگریزی تعلیم بجائے اس کے کہ قومی تعصبات سے دلوں کو پاک کرے اور اُلٹی تعصب و ناگواری کی آگ ملک میں مشتعل کرنے والی ہے ۔

بہرحال ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ جو مفید کام ہمارے دلی دوست مسٹر سری رام صاحب نے شروع کیا ہے ، اللہ تعالیٰ اُسے بخیر و خوبی انجام کو پہنچائے اور اس تصنیف کو قبول عام کے زیور سے آراستہ فرمائے ۔

آخر میں ہم معزز مصنف کی خدمت میں اس بات کے عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ صفحہ ٣٠٨ پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا حال لکھا گیا ہے ، اس میں چند فروگزاشتیں ہو گئی ہیں ، اول تو شاہ صاحب ممدوح کا اُردو زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا ۔ دوسرے ان کا وطن سرہند اور مجدد الف ثانی کی نسل سے ہونا اور فیروز شاہ کے کوٹلے میں سکونت پذیر ہونا ، غلط معلوم ہوتا ہے ۔ کسی طریقے سے اس غلطی کی اصلاح فرما دی جائے ۔

۳۹

حیات النذیر

(منقول از حیات النذیر، ۱۹۱۲ع ، صفحہ ۹ تا ۱۲)

یہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کی نہایت مفصل سوانح عمری ہے ، جو سید افتخار عالم مارہروی نے اُن کی زندگی ہی میں لکھنی شروع کر دی تھی مگر شائع اُن کی وفات کے بعد ہوئی ۔ آج کل نایاب ہے ۔

(محمد اسماعیل)

میں مصنف ”حیات النذیر“ کی اس خاص عنایت کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے مجھ کو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعے کا حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب ، پہلے اس سے کہ چھپ کر بہ ہمہ جہت تیار ہو جائے ، خاکسار کو عنایت کی ہے ۔ ظاہرا مصنف نے 'حیات النذیر' کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کر دی تھی ، ورنہ ان کی وفات کے بعد ، جس کو بہت زمانہ نہیں گزرا ، ایسی مفصل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا ۔ بہرحال مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا ، میرے نزدیک قوم کا کوئی اہل قلم اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکتا تھا ۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اردو لٹریچر پر کیا ہے اور اپنے جادو اثر لکچروں سے جو سکّہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے ، وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔ خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ

سے جو امتیاز اُنھوں نے ہندوستان کے علماے اسلام میں حاصل کیا ہے ، اس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کر سکیں گے ۔ جب اُن کی وفات پر ایک معتدبہ زمانہ گزر جائے گا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حبّ و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے ۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو اُنھوں نے کیا ہے اس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ۔ اس قلیل عرصے میں اس کے گیارہ ایڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور کل ایڈیشنوں کی کچھ اوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں ۔ اور اُس کی مانگ یوماً فیوماً زیادہ ہوتی جاتی ہے ۔ اس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کو اس وقت سوا سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی ، اُس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گزر چکے تھے ۔ اس عرصے میں اہل سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا ۔ مگر جب ترجمۂ نذیریہ کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی ، دفعۃً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمر بستہ ہو گئے اور چند سال کی مدت میں متعدد و جدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے ۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا ؟ شاہ صاحب کے ترجمے سے بہ سبب اس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمیِ قرآن کی ابتدائی حالت تھی ، قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمۂ نذیریہ کی با محاورہ اردو اور طرزِ اداے مطلب کی

مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور آن پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلام الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذت اور فائدہ اٹھانے لگا ۔ لیکن ان ترجموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمۂ نذیریہ کے الفاظ بدل دیے ، جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا معلوم نہیں ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجمِ قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں ، یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں ۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے ، نہ اُن کو پبلک میں ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حسنِ قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پہنچ سکتا ۔ بہرحال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہے ، اُس کی مفصل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ۔ اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کیے جائیں گے ۔ مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ، ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی ۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہے کہ اکثر صاحبوں نے ترجمۂ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (ممکن ہے کہ بعض صحیح ہوں) اور اکثر مدعیانِ ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اٹھایا ، مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دینا تو درکنار ، ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے منہ سے نکلتا ’’ان ھذا لشئٌ عجاب ۔‘‘

اب میں مصنف ’’حیات النذیر‘‘ کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں : اس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت اور خوش سلیقگی

سے لکھی گئی ہے ۔ باوجودیکہ راقم کی حالت مدت سے مطالعے کی اجازت نہیں دیتی ، پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں ۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنف نے جا بجا انتخاب کیے ہیں ۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے ، چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔ پس جب کہ عام تحریروں کا یہ حال ہے تو جو اقتباسات مصنف نے خاص توجہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کیے ہیں ، ظاہر ہے کہ وہ کس قدر دلآویز اور دلکش ہوں گے ۔ اس سے زیادہ ہم مولانا کی طرزِ تحریر کے متعلق اس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے ۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اس شخص کو اپنے سٹائل میں تھی ، وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی ، جو سرسید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے سٹائل میں حاصل تھی ۔ اسی طرح مولانا کے لیکچروں پر یہاں اس سے زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے ، جو بقول مصنف ، مسٹر ماریسن بالقابہ نے مولانا کے لکچروں کے متعلق کہا تھا کہ ’’صدہا برس تک یورپ ایسا سپیکر نہیں پیدا کر سکتا ۔‘‘

اس موقع پر مولانا کی تحریر و تقریر کا ذکر محض برسبیلِ تذکرہ آ گیا ہے کیوں کہ ہمارا اصل مقصد حیات النذیر کی ترتیب اور مصنف کے اس مہتم بالشان کام پر رائے زنی کرنا ہے ، ورنہ مولانا کی اعلیٰ لیاقتوں کے بیان کرنے کے لیے ایک مبسوط کتاب

لکھنے کی ضرورت ہے ۔

''حیات النذیر'' میں مصنف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی ، اُن کی طرزِ ماند و بود ، اُن کے اخلاق و عادات ، اُن کے اوقات و مشاغل ، اُن کے اعتقادات ، ان کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود اُنھی کی تصنیفات و تصریحات کی بنا پر کھینچا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالاتِ مذکورہ کے تفحص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے ۔ اور اس مقصد عظیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سچی بیوگراف سے جوگراں بہا فائدے آیندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں ، اُن کے پہنچانے میں تابہ مقدور کوتاہی یا بخل نہ کیا جائے ۔

اس بیوگراف کے متعلق ہم ریویو نگاری کا فرض ادا کرنے کی غرض سے مصنف کی خدمت میں ایک عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے ؛ اُنھوں نے جس طرح شاید ترجمۂ نذیریہ کی فوقیت ظاہر کرنے کے لیے اُس کا موازنہ دیگر جدید ترجموں سے کیا ہے ، اسی طرح کتاب ''الحقوق و الفرائض'' مرتبہ مولانا نذیر احمد کے بعض مقامات کا موازنہ ''حجة اللہ البالغہ'' کے ہم مضمون مقامات سے کیا ہے اور ''الحقوق و الفرائض'' کے بیانات کو ''حجۃاللہ البالغہ'' کے بیانات پر ترجیح دی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا یہ بیان مولانا کی نظر سے نہیں گزرا ، ورنہ ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مصنف کو ایسی دلیری کی اجازت دیتے ۔

مصنف نے شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت شمس‌العلماء مولانا شبلی کے اس قول کو نہایت تعجب سے دیکھا ہے کہ شاہ صاحب کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی ، رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے ۔ اس ریویو میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ شمس‌العلماء

کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کی جائے ، لہذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؟

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

انجمن ترقی اردو (ہند)
نئی دہلی

(ب) رسائل و اخبارات

۴۰

تسخیرِ شوہر

(منقول از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، جلد ۱۱ ، نمبر ۲۰
بابت ۲۴ مئی ۱۹۱۱ع ، صفحہ ۲۱)

یہ ایک چھوٹی تقطیع کی ۴۴ صفحے کی کتاب منشی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی اہلیہ نے تالیف کی تھی ، اور بلاشبہ مفید تھی ۔ در اصل اس کتاب کا محرک رسالۂ عصمت دہلی کا ایک انعامی اعلان تھا جو ستمبر ۱۹۱۰ع کے رسالے میں مسز زاہدی کی طرف سے شائع ہوا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

یہ ٹھیک اسی قبیل کی تالیف ہے جس کی اس زمانے میں کواری اور بیاہی شریف زادیوں اور شریف زادوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے نہایت ضرورت ہے ۔ کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ بیبیوں کو خاوندوں کے ساتھ اور خاوندوں کو بیبیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ برتنا چاہیے کہ طرفین میں روز بروز محبت ، ہمدردی اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا خیال زیادہ ہوتا جائے ۔ کبھی ان بن نہ ہونے پائے ، گھر کے انتظام میں خلل واقع نہ ہو ، اولاد کی تعلیم و تربیت پر میاں بی بی میں کش مکش نہ ہو ۔ کتاب کی زبان اور بیان کی خوبی پر یہی دلیل کافی ہے کہ اس کی عبارت کی اصلاح اس شخص نے کی ہے جس نے اردو کی ایک جامع ڈکشنری لکھ کر دلّی کی خاص زبان اور خاص محاورات کو سب سے پہلے تمام اہل ملک سے روشناس کیا ہے ۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مبتدی لڑکیوں اور لڑکوں کے حق میں یہ مختصر رسالہ نہایت مفید ہوگا ۔

۱

رسالہ ''ادیب''

(منقول از رسالہ 'ادیب' فیروز آباد، بابت جنوری ۱۸۹۹ع)

جہاں تک معلوم ہے، انیسویں صدی کے آخر میں تین ماہ نامے ہندوستان میں ''ادیب'' کے نام سے اردو میں جاری ہوئے۔ پہلا لکھنؤ سے ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۷ع کو شائع ہوا، اس کے ایڈیٹر ہدایت رسول مجدی تھے اور معمولی سا ۲۶ صفحات کا رسالہ تھا۔ دوسرا پٹنہ عظیم آباد سے زیرِ نگرانی نواب نصیر حسین خیال جولائی ۱۸۹۷ع میں اور تیسرا جنوری ۱۸۹۹ع میں فیروز آباد ضلع آگرہ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید اکبر علی اکبر آبادی تھے اور ۶۴ صفحات پر نکلا کرتا تھا۔ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ تھی۔ جب اس کا پہلا نمبر شائع ہوا تو ایڈیٹر نے ایک کاپی اظہار رائے کے لیے مولانا حالی کی خدمت میں بھی بھیجی۔ مولانا نے جو مختصر رائے اس کے متعلق لکھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے، یہ اسی رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ اس پرچے کا ایک سال کا مکمل فائل مولانا کی ذاتی لائبریری میں موجود تھا۔

(محمد اسماعیل)

ادیب کا پہلا نمبر پہنچا۔ ایک ہی جلسے میں اس کو اول سے آخر تک پڑھ گیا اور بہت محظوظ ہوا۔ ظاہرا یہ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

۲

رسالہ ”افسر“ حیدر آباد دکن

(منقول از مکتوبات حالی حصہ اول ، صفحات ۳۰ تا ۳۳ ، ۴۵ ، ۵۱)

۱۸۹۷ع میں نواب افسر الدولہ نے حیدر آباد دکن سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام ”افسر“ رکھا ۔ ۱۸۹۹ع کے آخر میں نواب صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کو جو اس وقت ریاست میں ملازم تھے ۔ اس کا ایڈیٹر مقرر کیا ۔ مولوی صاحب نے ایڈیٹر ہوتے ہی مولانا حالی کے نام اعزازی طور پر پرچہ بھیجنا شروع کیا اور ان سے اس پر ریویو کی درخواست کی ۔ مولانا نے اس رسالے پر مختلف اوقات میں پانچ مرتبہ اپنے خیال کا اظہار فرمایا ۔ چنانچہ پانچوں مرتبہ کی تحریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

۱- پہلی دفعہ

”افسر“ کا پہلا[1] نمبر موصول ہوا ۔ اس وقت دو تین میگزین ملک میں بہت عمدہ نکل رہے ہیں ۔ جیسے ”معارف“ اور ”ادیب[2]“

---

[1] پہلے نمبر سے مراد ہے مولوی عبدالحق کی ادارت میں شائع ہونے والے پرچے کا پہلا شمارہ ۔ (محمد اسماعیل)

[2] ”معارف“ پانی پت سے نکلتا تھا اور ” ادیب “ فیروز آباد سے ۔ (محمد اسماعیل)

وغیرہ ۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے میگزین کو سب سے فائق کر دو ۔ مگر یہ کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ اس نمبر کی جان نواب عمادالملک کا مضمون ہے ۔ یہ مضمون انگریزی میں کس مرتبہ کا ہوگا ؟ جبکہ اردو میں اس میں اس قدر لطافت باقی ہے ۔ ترجمہ بھی نہایت ہی عمدہ کیا گیا ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پبلک کے مذاق کے موافق کس قسم کے مضامین ہونے چاہئیں ؟ مگر میرے نزدیک ایسے پانچ سات مضمون آپ کے رسالے میں نکل گئے تو اس رسالے کی بہت شہرت ہو جائے گی ۔ میں جب تک کہ سرسید کی لائف سے فارغ نہ ہو لوں (اس رسالے کے لیے) کچھ نہیں لکھ سکتا ۔

الطاف حسین حالی از پانی پت

۳۰- جنوری ۱۹۰۰ع

۲- دوسری دفعہ

” افسر “ کا پانچواں نمبر پہنچا ۔ نہایت افسوس ہے کہ (اس میں) صحت کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا ۔ اول تو صحت ہر مضمون میں نہایت ضروری ہے اور خاص کر ایسے مضامین میں جو ایک بڑے گروہ کے مذہبی خیالات کے برخلاف شائع ہوتے ہیں صحت کا نہ ہونا نہایت قابل اعتراض ہے ۔ مولوی چراغ علی مرحوم کے مضمون ” استرقاق اور تسرّی “ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتیں ۔ (اس صورت میں) بہتر تو یہ ہے کہ اس مضمون کو از سر نو صحیح کرکے چھپوایا جائے ۔ ورنہ کم سے کم آن کے آئندہ مضامین میں صحت کا زیادہ اہتمام کیا جائے ۔ اگر صحت کا انتظام اچھا نہ ہوگا تو آپ کا رسالہ بدنام ہو جائے گا ۔

الطاف حسین حالی

۹- مئی ۱۹۰۰ع

۳- تیسری دفعہ

" افسر" کا چھٹا نمبر پہنچا - (رسالہ) "جدید اردو کے مشہور مصنفین" پر جو ریویو آپ نے تحریر فرمایا ہے اُس کو میں نے بہت غور سے پڑھا - شیخ عبدالقادر صاحب[۱] بی - اے ایڈیٹر (اخبار) "پنجاب آبزرور" (لاہور) نے یہ اسے[۲] میرے پاس بھی بھیجا تھا مگر چونکہ وہ انگریزی میں تھا اس لیے میں اُس کے مضمون سے مطلع نہیں ہو سکا - ہاں سرسری طور پر اُس زمانے میں جبکہ یہ مضمون " پنجاب آبزرور" میں چھپ رہا تھا - میں نے سنا تھا کہ اُنھوں نے فلاں فلاں اشخاص کے لٹریری ورکس[۳] پر کچھ لکھا ہے اور جو کچھ میری نسبت لکھا ہے - مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس کا بھی کسی دوست نے مجھ سے ذکر کیا تھا -

شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں اور میرے دوست ہیں - اُن کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اُردو لٹریچر سے بھی ایک خاص مناسبت ہے اور اس کا ثبوت یہی اسے ہے جو اُنھوں جدید اُردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے - اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع[۴] کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں اپنی فوقیت ثابت کر دی ہے کیونکہ آج تک دلی سے لکھنؤ تک کسی شخص نے (بھی) اس مضمون پر قلم نہیں اُٹھایا -

---

[۱] یہی صاحب ہیں جنھوں نے ۱۹۰۱ع میں اُردو کا مشہور ترین پرچہ "مخزن" نکالا اور بعد میں بہت اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے - گورنمنٹ انگریزی سے "سر" کا اعزاز اور "خان بہادر" کا خطاب پایا - (محمد اسماعیل)

[۲] اسے یعنی مضمون یا مقالہ - (محمد اسماعیل)

[۳] لٹریری ورکس یعنی ادبی کام - (محمد اسماعیل)

[۴] یعنی صوبجات آگرہ و اودھ - (محمد اسماعیل)

رہی یہ بات کہ بعض جزیات میں آپ نے اُن سے اختلاف کیا ہے - سو یہ اپنا اپنا مذاق اور اپنا اپنا ٹیسٹ ہے - مجھے بھی اُن کی رائے سے کسی قدر اختلاف ہے نہ اس نظر سے کہ اُن کی رائے میری نثر کی نسبت اچھی نہیں ہے - بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اردو لٹریچر کے ہیروز کا انتخاب جو اُنھوں نے کیا ہے وہ نہ جامع ہے اور نہ مانع -

میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے (رسالہ افسر میں) میری نثر کی نسبت کیے ہیں - دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر سچ (بات) یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں ، قائم نہیں ہو سکتیں مگر خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس کے اسٹائل میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے :

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست

(آپ) اس رسالہ کے ترقی دینے میں جہاں تک ہو سکے کوشش کیجیے اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کو برابر جاری رکھیے - انشاءاللہ تعالیٰ آخرکار خاطر خواہ کامیابی ہوگی -

الطاف حالی از پانی پت

۹- جون ۱۹۰۰

۴- چوتھی دفعہ

مئی اور جون (۱۹۰۱ع) کا " افسر" پہنچا - (اس میں) "حیات جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے

ہیں ۔ اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا ۔ لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں ۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں ۔ خدا تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور اپنے تمام مقاصد میں کامیاب کرے ۔

مئی (۱۹۰۱ع) کے پرچہ میں مسئلہ ازدواج پر جو مولوی محمد اختر صاحب کا مضمون چھپا ہے ۔ اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ نہ صرف میں نے بلکہ جس شخص نے (بھی) اُس کو دیکھا حد سے زیادہ پسند کیا ۔

(حیات جاوید پر) آپ کے ریویو کی تعریف کرنی مجھ کو زیبا نہیں ہے ورنہ وہی مثل ہوگی ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو''۔

الطاف حسین حالی

۲۸- نومبر ۱۹۰۱ع

۵- پانچویں دفعہ

کیا '' افسر'' بالکل بند ہو گیا؟ (افسوس ہے کہ) ہندوستان میں کوئی عمدہ رسالہ نہیں چل سکتا ۔ معارف ، ادیب ، حسن اور دیگر عمدہ عمدہ میگزین چند روز دنیا کی ہوا کھا کر نوبت بہ نوبت راہی ملک عدم ہو گئے ۔ پھر '' افسر'' کے چلنے کی کیا اُمید ہو سکتی تھی؟[1] (بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں) جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا ۔ اُس کا رونق اور فروغ پانا معلوم ؟

الطاف حسین حالی

۱۰- جولائی ۱۹۰۲ع

---

[1] مولانا حالی کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ افسر ۱۹۰۲ع کے شروع میں بند ہوا ہے ۔ یعنی اُس کی عمر قریباً پانچ برس کی ہوئی ۔ (محمد اسماعیل)

۳

رسالہ ''معارف''

(منقول از ماہنامہ 'معارف' پانی پت ، جلد ۴ ، نمبر ۱۰ ، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ع)

''معارف'' ایک بہت ہی اعلیٰ پایے کا علمی اور ادبی ماہنامہ تھا جو مولوی سید وحید الدین سلیم لٹریری اسسٹنٹ سرسید نے سرسید کے انتقال کے بعد ابتداءً علیگڑھ سے جاری کیا تھا ۔ نواب محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی اس رسالے میں ان کے شریک کار تھے اور رسالے پر دونوں کا نام لکھا جایا کرتا تھا ۔ مگر درحقیقت سارا کام سید صاحب ہی کرتے تھے ۔ اس بے نظیر ماہنامے کا پہلا پرچہ $\frac{۲۲ \times ۲۹}{۸}$ سائز پر بڑی شان کے ساتھ یکم جولائی ۱۸۹۸ع کو شائع ہوا ۔ یہ ملک میں اردو زبان کا سب سے پہلا ادبی پرچہ تھا جو اس شان سے نکلا کہ جس نے دیکھا حیران رہ گیا ۔ تین برس تک مولانا سلیم اسے علی گڑھ میں شائع کرنے کے بعد ۱۹۰۱ع کی ابتدا میں اپنے وطن پانی پت لے آئے اور یہاں آ کر جنوری ۱۹۰۱ع سے اس کی چوتھی جلد کا آغاز کیا ۔ پانی پت آتے ہی نواب محمد اسماعیل خاں کا نام رسالے کی پیشانی پر سے اُڑا دیا گیا ۔ مولوی سید وحید الدین سلیم پراپیگنڈہ کے فن سے ناواقف تھے اس لیے رسالہ نہ چل سکا اور مالی پریشانیوں کی وجہ

سے دسمبر ۱۹۰۱ع میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ۔ اس کے سولہ برس بعد مولوی سید سلیمان ندوی مرحوم نے اعظم گڑھ سے اسی نام کا ایک پرچہ نہایت شان سے جاری کیا جس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۱۶ع میں نکلا اور آج تک جاری ہے ۔

’معارف‘ کے متعلق جو رائے مولانا حالی نے لکھ کر مولوی سید وحید الدین سلیم کو علی گڑھ بھیجی تھی وہ آنھوں نے آسی وقت رسالے میں شائع کر دی تھی اور وہیں سے لے کر یہاں درج کی جا رہی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

’’معارف‘‘ بے شک آن رسائل میں عمدہ ترین رسالہ ہے ، جو ہندوستان میں اس وقت نکل رہے ہیں ۔ میں ’’معارف‘‘ کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ملک کے موجودہ میگزینوں میں اس کو خاص امتیاز کی نظر سے دیکھتا ہوں ۔

الطاف حسین حالی

۴

رسالہ ’’اتحاد‘‘

(منقول از رسالہ اتحاد ، جلد ۱ ، نمبر ۳ ، بابت یکم مئی ۱۹۰۴ع ، صفحہ ۱)

مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم نے ’’اتحاد‘‘ کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ لکھنو سے جاری کیا تھا جس کا واحد مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالنا تھا ۔ رسالے کا پہلا پرچہ یکم اپریل ۱۹۰۴ع کو شائع ہوا تھا ۔ یہ ریویو اسی کے متعلق ہے ۔ رسالے کی تقطیع ۲۰×۲۶ تھی اور صفحات بالعموم ۱۶ ہوا کرتے تھے ۔ مولانا حالی نے بھی بعض مضامین آس میں لکھے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

جس مقصد کے لیے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے ، اس کو میں ایسا ضروری اور اہم جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی مقصد نہیں ہو سکتا ۔

۵

دکن ریویو

(منقول از 'دکن ریویو' بمبئی، جلد ۳، نمبر ۲، بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ع)

جب مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار لاہور) ریاست حیدر آباد دکن میں ملازم تھے تو انھوں نے ۱۹۰۳ع میں بمبئی سے ایک ادبی اور علمی ماہنامہ دکن ریویو کے نام سے جاری کیا۔ جب ۱۹۰۹ع میں وہ حیدر آباد سے خارج کر دیے گئے تو یہ پرچہ بند ہو گیا۔ ۱۹۰۵ع میں اس پرچے کے متعلق مولانا حالی نے جو تحریر بصورتِ خط لکھ کر ظفر علی خاں صاحب کو حیدرآباد بھیجی تھی، وہ میرے محترم دوست پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی ایم۔ اے معتمد کتب خانہ' ادبیات اردو حیدر آباد نے ''دکن ریویو'' سے نقل کرکے بھیج دی ہے۔ میں جناب صدیقی صاحب کے نہایت شکریے کے ساتھ اس کو یہاں درج کر رہا ہوں۔ (محمد اسماعیل)

اس وقت حسن اتفاق سے تھوڑی دیر کے لیے مکروہاتِ خانگی سے نجات ملی تھی۔ جنوری ۱۹۰۵ع کا ''دکن ریویو'' سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ سرے ہی پر آپ کی نظم جو ''رود موسیٰ'' پر لکھی گئی ہے، نظر پڑی۔ اول سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب

یہ ہو گیا ہے کہ پرانی طرز کی نظمیں تو (الا ماشاء اللہ) اس لیے دیکھنے کو دل نہیں چاہتا کہ اُن میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو لفظ جادو کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی تحیّر ہوا تھا۔ لیکن اُس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ اور ایسا کلام جو دل کے جوش سے نکلتا ہے خواہی نخواہی موثر اور دلکش ہوتا ہے۔ لیکن 'رود موسیٰ' پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے یہ محض زور طبع اور شاعری کی خدا داد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں اور پیدا ہو جائیں تو مجھے امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے گی۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسماعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پادر رکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ بہ شرطیکہ آپ کو فکر معاش دم لینے دے اور یہ چیٹک بھی دل کو لگی رہے۔[1]

امید ہے کہ آپ بہمہ وجود خیریت سے ہوں گے۔ والسلام خیر مقام۔

پانی پت ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ع خاکسار الطاف حسین حالی

---

[1] افسوس مولانا کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور ظفر علی خاں کو لاہور آکر سیاست کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتے۔ (محمد اسماعیل)

٦

رسالہ ''زمانہ''

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ٦٦ - ٦٧)

رسالہ زمانہ آن خاص الخاص ادبی ماہناموں میں سے تھا جنھوں نے سال ہا سال تک آردو ادب کی پر خلوص خدمت کی - یہ بلند پایہ رسالہ منشی دیا نرائن نگم بی - اے کی زیر ادارت کان پور (یو - پی) سے ۱۹۰۳ع میں جاری ہوا اور غالباً ۱۹۵۲ع تک جاری رہا - اس رسالے کے متعلق حضرت مولانا حالی نے اپنی رائے ایک خط میں لکھ کر ایڈیٹر کو بھیجی تھی جو پانی پت سے آپ نے ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ع کو کان پور بھیجا تھا -

(محمد اسماعیل)

زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو آن مستثنی رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو آردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں - میری دلی آرزو ہے کہ ''زمانہ'' نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی اور تہذیب میں روز افزوں ترقی کرے اور جو صلح کل مسلک اس نے اختیار کیا ہے اس سے سرمو تجاوز نہ کرے -

---

۷

رسالہ ''آفتاب''

(منقول از رسالہ آفتاب جلد ۲ بابت فروری ۱۹۰۷ع ، صفحہ ۲)

''آفتاب'' نامی ایک ماہوار رسالہ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے سید محمد حسین صاحب رضوی کی زیر ادارت فروری ۱۹۰٦ع میں جاری ہوا تھا - مندرجہ ذیل خط ریویو کے طور پر مولانا نے ایڈیٹر کو لکھا تھا - مولانا اس وقت حیدرآباد میں تھے اور آپ نے وہیں سے یہ ریویو لکھ کر بھیجا تھا - مولانا حالی کی لائبریری میں اس رسالے کی ایک جلد موجود تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے دنوں تک نکلتا رہا اور کب بند ہوا - رسالے کی تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲٦}{۸}$ تھی اور صفحات بالعموم ۴۸ ہوتے تھے -

(محمد اسماعیل)

مکرمی ! رسالہ ''آفتاب'' کے دو نمبر پہنچے - آن کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی - اور پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی کیونکہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی امید ہے - بابو امبا لال صاحب کا مضمون ''تعلیم'' پر اور آپ کا مضمون ''تعصب'' پر بھی بہت عمدہ مضمون ہیں - خدا سے امید ہے کہ ''آفتاب'' ملک میں چمکے گا - دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور ''آفتاب'' کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے -

۸

پنجاب ریویو

جب ۱۹۰۹ع میں مولانا ظفر علی خاں ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے فارغ کر دیے گئے تو آنھوں نے واپس آکر اگست ۱۹۱۰ع میں ایک ادبی ماہنامہ اپنے وطن کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے نکالا ، جس کا نام ''پنجاب ریویو'' رکھا ۔ اور اپنے والد مرحوم حضرت مولانا سراج الدین احمد کے اخبار ''زمیندار'' کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے ترقی دی ۔ سیاست کے ساتھ ساتھ ادبیت کم ہی چل سکتی ہے ۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں صاحب کے سیاسی شوق پر پنجاب ریویو کو قربان ہونا پڑا اور وہ جلد بند ہو گیا ۔ مگر اخبار ''زمیندار'' کو آنھوں نے صرف زمینداروں کی اصلاح کے تنگ دائرے سے نکال کر سیاست کے وسیع میدان میں لا ڈالا ۔ حضرت مولانا حالی کی یہ رائے اسی پنجاب ریویو کے متعلق ہے جو آنھوں نے ایک خط میں لکھ کر ایڈیٹر کو بھیجی تھی ۔ مولوی ظفر علی کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ع کو ہوا ۔

(اسماعیل)

'' پنجاب ریویو '' کا پہلا نمبر جس خوبی سے شائع ہوا اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ مولوی محمد عزیز میرزا صاحب کا مضمون ، حے راجپوری صاحب کا مضمون اور 'مجذوب کی بڑ' تینوں مضمون نہایت دلچسپ ہیں ۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجے کا وہ مضمون ہے جو ایڈیٹر کے قلم جادو رقم نہیں بلکہ اعجاز رقم سے مترشح ہوا ہے ، اور اس کے آخر میں جو چند اشعار آپ نے برمحل اضافہ کیے ہیں ، وہ آپ ہی کا حصہ ہے ۔ ان الفاظ میں سر مو تصنع کو دخل نہیں ۔ وہ اشعار مولوی سید وحید الدین صاحب نے مجھے اور سجاد حسین کو پڑھ کر سنائے تھے ، قاری اور سامع سب وجد کرتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت دے اور آپ اپنی خدا داد لیاقت کے جوہر اسی طرح مدت دراز تک ظاہر کرتے رہیں ۔

۹

روزنامہ ’’ہمدرد‘‘

(منقول از مکاتیب حالی، صفحہ ۱۰۸ و ۱۰۹)

یہ نہایت بلند پایہ سیاسی روز نامہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر بی۔ اے نے ۱۴ جون ۱۹۱۳ء کو دہلی سے جاری کیا۔ جب پہلی مرتبہ اخبار جاری ہونے کو ہوا اور مولانا محمد علی نے حضرت مولانا حالی سے اس کے لیے کسی مضمون کی بذریعہ تار درخواست کی تو اس پر حضرت مولانا نے ’’ہمدرد‘‘ کو اپنا تاثر لکھ کر دہلی بھیج دیا جو ایک خط کی صورت میں تھا اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ رئیس الاحرار کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں ہوا اور بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔ (محمد اسماعیل)

تار اسی وقت پہنچا۔ جواب چوں کہ طولانی تھا اس لیے تار کے ذریعے سے نہیں بھیجا۔ ’ہمدرد‘ کے باقاعدہ جاری ہونے کی خبر سے اس لیے بے انتہا مسرت ہوئی کہ میری زندگی میں دلی کو یہ عزت حاصل ہونے والی ہے کہ اردو کا عمدہ ترین پرچہ یاس و امید کی سخت کش مکش کے بعد وہاں سے جاری ہونے والا ہے۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ جب پہلی ہی بار ’ہمدرد‘ کے نکلنے کا چرچا ہوا تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کے خیال سے ’ہمدرد‘ میں درج کرنے کے لیے مولانا نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری مرتبہ

سید افتخار عالم پر ریویو لکھ کر دفتر ’کامریڈ‘ میں مولانا عبدالحلیم شرر کی خدمت میں بھیجا تھا اور دو رباعیاں بھی ’ہمدرد‘ کے مناسب حال لکھ کر ریویو کے ساتھ ہی بھیج دی تھیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ریویو (اگرچہ اس کی نقل سید افتخار عالم کے پاس موجود ہے) اب تک کسی اخبار میں نہیں چھپا۔ اگرچہ یہ ریویو کچھ چیز نہیں ہے مگر ایک قریب المرگ آدمی کے منہ سے جو الفاظ بُرے یا بھلے نکل جاتے ہیں، اُن ہی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ میں فی الواقعہ اب مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہا۔ اگر مذکورہ بالا ریویو آپ کے دفتر میں پہنچ جائے تو اس کو پہلے پرچے میں چھپوا دیجیے۔ اگر میرے پاس اس کا کٹا کٹایا مسودہ پہنچ گیا تو میں کل ان شاء اللہ اس کو بھی روانہ کر دوں گا۔

دونوں رباعیاں تو مجھے یاد ہیں، وہ اسی خط میں لکھے دیتا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو ان کو بھی اول پرچے میں کسی موقع پر چھپوا دیجیے گا۔

رباعی

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یارب
’’ہمدرد‘‘ کو اسمِ بامسمیٰ کیجو!
اس نام کی لاج ترے ہی ہاتھ ہے اب

دیگر

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اٹھتے ہیں ایک ہاں پہ واں پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں[1]

خاکسار الطاف حسین حالی

---

[1] یہ دونوں رباعیاں ’’ہمدرد‘‘ کے پہلے پرچے میں شائع ہوئیں جو ۱۴ - جون ۱۹۱۳ء کو دہلی سے جاری ہوا تھا۔ (اسماعیل)

۱۰

رسالۂ ”العصر“

(منقول از مکاتیب حالی ، صفحہ ۱۱۰)

میرٹھ (یو ۔ پی) کے رہنے والے ایک صاحب لالہ پیارے لال نامی عیسائی ہو گئے تھے ۔ خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے ۔ کچھ دنوں (جولائی ۱۹۱۱ع سے دسمبر ۱۹۱۲ع تک) الہ آباد کے مشہور ادبی ماہنامہ ”ادیب“ کے ایڈیٹر رہے ۔ وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۱۳ع میں لکھنؤ سے ”العصر“ جاری کیا جو ”ادیب“ کے پایے کا ماہ نامہ تھا ۔ پرچہ شائع کرتے ہی اُنھوں نے مولانا حالی کے نام جاری کر دیا اور اُن سے اس پر اظہار رائے کی درخواست کی ۔ جس پر مولانا نے اپنے خط مورخہ ۱۹ جون ۱۹۱۳ع کے ذریعے ”العصر“ کے متعلق اپنی رائے لکھ کر اُنھیں بھیج دی ۔ شاکر صاحب ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ع کو پیدا ہوئے اور ۲۰ فروری ۱۹۵۶ع کو انتقال کیا ۔

(محمد اسماعیل)

”العصر“ کے تینوں نمبر پہنچے جن کا شکریہ ادا کرنے میں دیر ہوگئی ۔ یہاں تک کہ آپ کو خط لکھنے کی زحمت ہوئی ۔ ”العصر“ کو دیکھ کر بہت جی خوش ہوا ۔ اللہ تعالیٰ اس کو

سرسبز اور کامیاب کرے ، ضرور ایسا ہی ہوگا ۔ ”ادیب“ کے ذریعے آپ کی لیاقت کے جوہر کھل چکے ہیں ۔ ”العصر“ میں میرا فوٹو جس جس نے دیکھا نہایت پسند کیا ، اور تصویریں بھی نہایت عمدہ چھپی ہیں ۔

١١

رسالہ ''آردو''

(منقول از رسالہ ''اردو'' بابت اکتوبر ١٩١٣ع)

> مولوی فتح محمد خاں مرحوم جالندھری نے ''آردو'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جالندھر سے نکالا تھا۔ اس کا پہلا ڈبل نمبر ستمبر و اکتوبر ١٩١٣ع میں شائع ہوا۔ ناقدری کی وجہ سے دو ہی تین نمبر نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔ اس کا پہلا نمبر میری لائبریری میں بھی موجود ہے۔ مولوی فتح محمد نہایت لائق شخص اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔
> (محمد اسماعیل)

''آردو'' اس نام کا ایک رسالہ پنجاب کے نامور مصنف جناب مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری نے انھیں دنوں میں شہر جالندھر سے نکالا ہے، جس کا پہلا نمبر میری نظر سے گزرا۔ تقریباً دس برس کا عرصہ گزرا ہوگا کہ پٹیالا کے مشہور مدبر و رکن ریاست مرحومی جناب خلیفہ سید محمد حسین خاں صاحب بالقابہ نے ایک صحبت میں فرمایا تھا کہ ملک میں ایک ایسا رسالہ جاری ہونے کی سخت ضرورت ہے جس کا مقصد براہ راست محض اردو زبان کی خدمت اور آس کے لٹریچر کی اصلاح ہو۔ اگرچہ آس وقت تمام حاضرین نے بالاتفاق اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا، مگر گزشتہ دس سال میں نہ آس پر کچھ عمل درآمد ہوا اور نہ کسی کو وہ بات یاد رہی۔ مگر اصلی اور حقیقی ضرورتوں سے کیسی ہی بے اعتنائی

یا بے پروائی کی جائے، وہ کبھی نہ کبھی ضرور پوری ہو کر رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ بغیر کسی کی تحریک کے خودبخود اس کے پورا کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ رسالہ جس کا نام ''اردو'' رکھا گیا ہے، اسی ضروری مقصد کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک آس کا صرف ایک نمبر شائع ہوا ہے جس سے آس کے مستقبل کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ''سالے کہ نکوست از بہارش پیداست'' ہم کو قوی امید ہے کہ یہ رسالہ مقبول خاص و عام ہوگا۔ اول تو جو مضامین پہلے نمبر میں شائع ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں ہیں، دوسرے رسالے کا مقصد ایسا اہم اور ضروری ہے جو پبلک کو بزور آس کی طرف متوجہ کرے گا۔ تیسرے دہلی، جو آردو زبان کا مرکز ہے، آس کا دارالخلافہ بننا رسالے کی اشاعت کے حق میں خود ایک بڑی فال نیک ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس زبردست ہاتھ میں رسالے کی باگ ہے، وہ ہاتھ ہی آس کی ترقی اور قیام کا ضامن ہے۔

ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ تمام ملک میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے اور اردو زبان کو آس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے اور مالک و مہتمم کی مساعی جمیلہ مشکور ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربا لعالمین

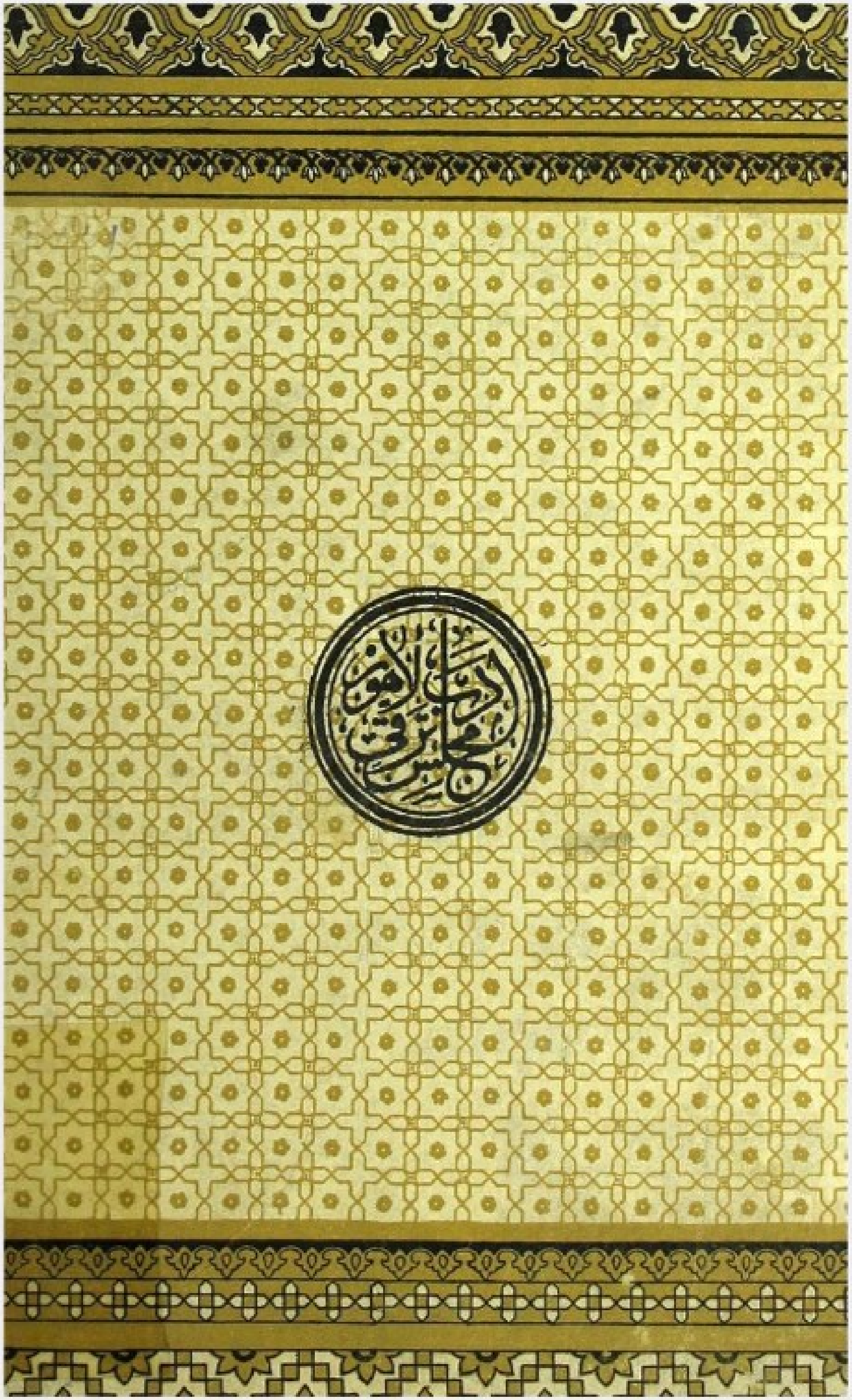

۱۲

رسالہ ”عزیز“

(۱۹۱۴ع)

(رسالہ افادہ آگرہ ، جلد ۲ ، بابت ماہ مارچ ۱۹۱۵ع)

اکبر آباد (آگرہ) سے غالباً ۱۹۱۳ع میں ایک ماہوار رسالہ ”عزیز“ کے نام سے نکلا کرتا تھا ۔ اس میں بچوں کے لیے آسان اور دلچسپ مضامین اور کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں ۔ دو روپے سالانہ اس کی قیمت تھی ۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا اپنی عمر کی آخری منزل طے کر رہے تھے ۔ مگر اُن کے اخلاق و مروت کا یہ حال تھا کہ جب ایڈیٹر صاحب رسالہ عزیز نے اپنا پرچہ اُن کے پاس بھیجا اور اُن سے خواہش کی کہ اس کے متعلق کچھ لکھ دیں تاکہ وہ اس تحریر کو اشتہار کے طور پر استعمال کر سکیں ، تو مولانا نے لیٹے ہی لیٹے اپنے ایک عزیز سے اُس کے بعض مضامین پڑھوا کر سنے اور پھر ایک مختصر ریویو اُنھیں لکھوا کر بھیج دیا جسے اُنھوں نے بعد میں بطور اشتہار استعمال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

”عزیز“ کے دو تین مضمون میں نے پڑھوا کر سنے ۔ اُمید ہے کہ آپ کے اہتمام میں یہ بچوں کا عزیز بہت ترقی کرے گا اور مفید ثابت ہوگا ۔